اسلامی اقدار کا نقیب

ہفت روزہ

ترجمانِ اسلام

لاہور

نگرانِ اعلیٰ
مولانا مفتی محمود
مدظلہ

23/9

اِسلامی نظامِ حکومت

بالغ رائے دہی اور حکمرانوں کا چناؤ

دارالعلوم دیوبند کا جشن صد سالہ
اور پیش آمدہ مشکلات (اداریہ)

۲۸ فروری تا ۶ مارچ ۸۰ء

قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

ج ۲۲ شمارہ ۹

نعت

بحضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم

جنکو تھوڑا سا بھی وحدت کا پتہ ہوتا ہے
اُنکا صرف ایک رسولؐ ایک خدا ہوتا ہے

اک زباں کذب بیانی کے لیے ہوتی ہے
اک دہن نغمہ گہہ صلِّ علیٰ ہوتا ہے

تُو بھی، رو رو کے تہجّد میں دُعا مانگا کر
یہی لمحے ہیں کہ جب نالہ رسا ہوتا ہے

قُمریاں ہوں کہ عنادِل کہ مرالطائرِ دل
حسبِ توفیق ہر اک مدح سرا ہوتا ہے

بارشِ سنگ ہو سر پر کہ لب و دنداں پر
عشق ہر حال میں راضی بہ رضا ہوتا ہے

سچ تو یہ ہے کہ مدینے کے سفر میں بیدلؔ
بخت والا ہی کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

انسان کی تکریم ہوئی ذات سے تیریؐ
یہ آدمِ خاکی ترےؐ صدقے میں بڑا ہے

سب صبح و مسا حمد و ثنا کرتے ہیں جس کی
وہ خالقِ کونین ترا مدح سرا ہے

بدعت کے پرستار ترے ہو نہیں سکتے
تیرا ہے وہی جو تری سنّت پہ فدا ہے

اسلام اداؤں پہ فدا ہونا ہے تیری
ایمان ہے کیا چیز؟ تریؐ مدح و ثنا ہے

احسان ہے احسان ہے احسان ہے تیرا
مخلوق کو خالق کا پتہ تُوؐ نے دیا ہے

کیوں اپنے مقدّر پہ وہ نازاں نہ ہوں اکرامؔ
سرکارِ مدینہ کا جنھیں عشق ملا ہے

اکرام انصاری

ہفت روزہ
ترجمان اسلام
لاہور

جلد نمبر ۲۲ | شمارہ نمبر ۹

جمعۃ المبارک

— سرپرست —
مولانا عبید اللہ انور

— مدیر —
اکرام القادری

— مدیر معاون —
عمیر الہاشمی

— بدلِ اشتراک —
سالانہ
۶۵ —— روپے
ششماہی
۳۳ —— روپے
سہ ماہی —— ۱۷ روپے
— قیمت —
ایک روپیہ پچاس پیسے

خط و کتابت : ترجمانِ اسلام چوک رنگ محل لاہور

دار العلوم دیوبند کا جشن صد سالہ اور پیش آمدہ مشکلات

مادرِ علمی دار العلوم دیوبند کی دینی ، ملی ، قومی اور ہمہ جہت خدمات سے ایک عالم آشنا ہے ۔ انسانی زندگی کا کونسا پہلو اور کونسا ایسا شعبہ ہے جس میں دار العلوم دیوبند کے فضلاء و اکابر نے کارہائے نمایاں انجام نہیں دیے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا نہیں منوایا۔

فرزندان دار العلوم دیوبند کی دینی و ملی کارکردگیوں کا سلسلہ نہ صرف برصغیر پاک ہند اور بنگلہ دیش تک ہی وسیع ہے بلکہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے ۔ دنیا کے کسی گوشے میں چلے جائیے آپ کو دار العلوم کے فیض یافتہ اور وابستگان ملیں گے جو انتہائی جانفشانی اور اخلاص وللہیت سے خدمت دین متین میں پیش پیش نظر آئیں گے ۔ یہ کہنا بھی خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ دنیا میں دین اسلام کی صحیح تصویر جہاں جہاں بھی نظر آرہی ہے وہ وابستگان دار العلوم کی مساعی حسنہ کی رہین منت ہے ۔

دار العلوم کو قائم ہوئے سو سال سے زائد ہوگئے ہیں۔ اس عرصہ میں جو کچھ اس نے ملت اسلامیہ کو دیا وہ کسی انصاف پسند سے مخفی نہیں۔ تدریسی ، تعلیمی ، اصلاحی ، تبلیغی اور سماجی دائرۂ عمل سے نکل کر دار العلوم کے فضلاء اور اکابر نے جب سیاست کے خارزار میں قدم رکھا تو ایسے انمٹ نقوش تاریخ کے اوراق میں ثبت کئے جو رہتی دنیا تک قائم و دائم رہیں گے ۔ تحریک آزادی اور تحریک پاکستان میں دی جانے والی بے مثال قربانیوں کا باب فضلاء دار العلوم کا تذکرہ کئے بغیر نامکمل ہی رہے گا ۔ اس ضمن میں بہت کچھ لکھا اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے ، مگر فی الحال ہمیں ۲۱ - ۲۲ - ۲۳ ، مارچ ۱۹۸۰ء میں منعقد ہونے والے صد سالہ جشن دار العلوم دیوبند کے سلسلے میں جشن میں شرکت کرنے والے ان فضلاء دار العلوم کی پریشانیوں اور الجھنوں کا تذکرہ کرنا ہے جو اس ضمن میں پیش آرہی ہیں۔

پاکستان میں ایسے ہزاروں فضلاء موجود ہیں جنہوں نے باقاعدہ دار العلوم دیوبند میں تعلیم و تربیت حاصل کی ہے ۔ یہ فضلاء دار العلوم کے جشن صد سالہ میں شرکت کے لئے بیتاب ہیں ۔ انہیں دار العلوم کے کارپردازوں کی طرف سے باقاعدہ دعوت نامے بھی موصول ہو

چکے ہیں اور ان میں سے بہت سوں کے پاسپورٹ بھی بنے ہوئے ہیں اور بعض کو تو ویزا بھی ملا ہوا ہے، اس کے باوجود انڈیا سفارت خانے کی طرف سے دیوبند کا ویزہ دینے سے یہ کہہ کر انکار کیا جا رہا ہے کہ یہ ایک بین الاقوامی جشن ہے جب تک حکومت پاکستان اس کے لئے خصوصی اجازت نہ دے دیوبند کا ویزا نہیں دیا جا سکتا۔ ہم حکومت پاکستان سے پُر زور درخواست کریں گے کہ وہ فضلاء دارالعلوم کی ان مشکلات کو جلد حل کرے تاکہ یہ اپنی مادر علمی کے ہونے والے صد سالہ جشن میں شرکت سے محرومی کے احساس کا شکار نہ ہوں۔

اس کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں متوسلین دارالعلوم دیوبند اس صد سالہ جشن میں شرکت کا ارادہ رکھتے ہیں؛ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جشن میں شمولیت کے لئے مضطرب ہیں۔ انہیں اگر حکومت چند یوم کے لئے سرکاری سطح پر جشن میں شرکت کے لئے انڈیا جانے کی اجازت دیدے تو اس میں جہاں ہزاروں افراد کو یہ سعادت حاصل ہوگی وہاں حکومت کی بھی نیک نامی ہے۔ اس سے قبل کرکٹ کھیل میں جانے کے لئے حکومت نے یہ اجازت دی بھی ہے۔

دارالعلوم کا یہ صد سالہ جشن خالص دینی اور مذہبی اجتماع ہے محض موہوم خدشات کی وجہ سے حکومت کا اس میں شرکت کی اجازت دینے میں ٹال مٹول سے کام لینا لاکھوں عوام میں مایوسی پیدا کرنے کے مترادف ہے۔

ہماری شنید کے مطابق علماء کا ایک وفد اس سلسلے میں وزارتِ خارجہ کے کارپردازوں سے ملا بھی ہے اور انہوں نے عجلت میں مرتب کردہ ایک بہت ہی محدود سی فہرست بھی حکومت کو پیش کی ہے۔ حکومت کو عامۃ المسلمین کے دینی جذبات کا احساس کرتے ہوئے جشن میں شرکت کی سرکاری سطح پر پوری فراخدلی سے اجازت دے دینی چاہیئے۔

جماعتی احباب کی ذمہ داریاں:

ادارہ ترجمان اسلام اپنی تمام تر مجبوریوں، مشکلات اور ناساعد حالات کے باوجود ترجمان اسلام کی اشاعت کو باقاعدگی سے برقرار رکھے ہوئے ہے۔ کاغذ اور پوسٹل ٹکٹوں کی گرانی کے علاوہ عام مہنگائی کے باوجود ترجمان اسلام کے معیار میں اضافہ کی طرف بھی متوجہ ہے اور اس طرح سے پرچہ دینی اور قومی خدمات کی بھرپور کوشش کر رہا ہے، مگر ہمیں نہایت ہی دکھ اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہم مسلک جماعتی احباب اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں کر رہے۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی سے قبل بھی ایجنسی ہولڈروں کی عدم ادائیگی کی رفتار نہایت سست تھی لیکن اب اس میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ پرچہ باقاعدگی سے پہنچ رہا ہے مگر اکثر وبیشتر حضرات کی طرف سے بل ادا نہیں کئے جا رہے اور یہ ایجنسی ہولڈر عموماً ہم مسلک جماعتی احباب ہی ہیں۔

ان حضرات کے عدم تعاون کی وجہ سے پرچہ کی اشاعت بھی متاثر ہو رہی ہے اور ادارہ بھی مسلسل نقصان میں جا رہا ہے۔ خدانخواستہ اگر جماعتی احباب نے اپنی دینی ذمہ داریوں کو بروقت محسوس نہ کیا تو عین ممکن ہے کہ ہمارے ہم مسلک دوست اور دینی حلقے پرچہ سے محروم ہو جائیں۔

ہم اپنے دوستوں سے چندے یا اعانت کی صورت میں ادارے کے لئے اپیل نہیں کرتے فی الحال وہ اتنا کرم مزید کریں کہ اپنے اپنے علاقے کے ایجنسی ہولڈروں سے رابطہ قائم کریں اور ادارے کی جو رقم ان کے ذمہ ہے وہ ادارے کو ارسال کرا دیں۔ خود جو لوگ پرچہ فروخت کرتے ہیں یا جن کی ذمہ داری پر پرچہ ارسال کیا جا رہا ہے وہ بھی فوری طور پر اس طرف متوجہ ہوں اور زیادہ سے زیادہ رقم ارسال کریں۔

جماعتی احباب سالانہ اور ششماہی خریداروں کی شکل میں بھی ادارے سے تعاون کر سکتے ہیں اور اشتہارات کی صورت میں بھی اگر ہمارے دوستوں نے اپنی دینی اور جماعتی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے کچھ نقل و حرکت کی تو بہت جلد مثبت نتائج سامنے آئیں گے اور ترجمان اسلام پہلے سے زیادہ دینی خدمت کیلئے مستعد ہوگا۔

ادارہ دو ہفتہ انتظار کے بعد ان حضرات کے نام شائع کر دے گا جن کے ذمہ ادارے کی خطیر رقم ہے اور بار بار خطوط لکھنے کے باوجود وہ جمود کا شکار ہیں اور ایک دینی ادارے کی رقم دبائے ہوئے ہیں۔

اسلامی ریاست پاکستان میں سودی کاروبار

میاں ذوالفقار علی لاہور

پاکستان کا مطالبہ اس لئے کیا گیا تھا کہ اس اسلامی ملک میں خدا کا نظام نافذ ہوگا، اور اس اسلامی ملک کے مسلمان اپنی زندگی کے تمام مسائل احکام خداوندی اور فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق حل کریں گے، اور پاکستان میں ایک ایسی حکومت قائم ہوگی جس کا قیام اس صحیح انسانیت کے اصول پر ہوگا جس کی تدوین قرآن حکیم میں کی گئی ہے۔

جب اگست ۱۹۴۷ء کو ریاست پاکستان معرض وجود میں آگئی تو اس میں اسلامی آئین نافذ کرنے کی بجائے انگریز کا چھوڑا ہوا آئین ہی پاکستان کے مسلمانوں پر مسلط کر دیا گیا اور پچھلے تینتیس سال سے انسانوں کے بنائے ہوئے غیر شرعی قانون کی ہی فرمانبرداری رہی ؛ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس غیر اسلامی آئین کے زیر سایہ پاکستانی قوم کے کردار اور اخلاق بری طرح مجروح ہوئے اور قوم کے اندر ہر برائی نے جنم لیا۔ ان برائیوں میں ایک برائی سودی کاروبار کا مہلک مرض ہے۔ پاکستان میں سود کے کئی طریقے رائج ہیں۔ اوّل بہت سے غیر سرکاری ادارے اور بعض سود خور افراد لوگوں کو نقد روپیہ قرض دیتے ہیں اور ایک مدت معین کر کے فی روپے کے حساب سے کچھ مقدار سود کی لگاتے ہیں اور معین مدت ختم ہونے کے بعد سود اور اصل قرض کی رقم ملا کر اس کو اصل قرار دے کر اور اس مجموعی رقم پر سود وصول کرنا شروع کر دیتے ہیں ؛ اور یہ سود خور لوگ ضرورت مندوں کے سونے کے زیورات، برتن مکانات. زمین۔ قیمتی پارچہ جات اور دیگر ہر قسم کی جائیداد رہن رکھ کر اس کے عوض قرض دے کر اس پر سود وصول کرتے ہیں۔

دوئم ملازمین کی جمع شدہ رقوم پر سود دیا جاتا ہے اور ان کو قرض کی رقوم دے کر سود لیا جاتا ہے۔ سرکاری زراعتی اور صنعتی بنک اور دیگر بہت سے سرکاری بینک زمینداروں صنعت کاروں اور دیگر حاجتمندوں کو قرض دیتے ہیں اور ان سے سود وصول کرتے ہیں۔ سرمایہ دار اور صاحب جائیداد لوگ مختلف سرکاری بنکوں میں اپنی بھاری رقوم رکھتے ہیں اور ان بنکوں سے سود وصول کرتے ہیں۔ مختلف سرکاری بینک عوام کو سونے، مکانات اور دیگر ہر قسم کی جائیداد رہن رکھ کر اس کے عوض قرضے جاری کرتے ہیں اور لوگوں سے سود وصول کرتے ہیں۔ صنعتکار۔ تاجر۔ زمیندار۔ کارخانہ دار ٹھیکیدار۔ سرکاری ملازمین ان سب کی کمائی میں بنک کا سود شامل ہوتا ہے اور ان کے منافع کی تہ میں سود کی شکل موجود ہوتی ہے۔ بین الاقوامی لین دین میں سود کی آمیزش شامل ہوتی ہے۔ جو زائد رقوم انشورنس کمپنیوں یا باہمی شراکت سے حاصل کی جاتی ہے وہ رقوم سود کی شکل ہے۔ چند افراد مل کر ایک باہمی تعاون سے ایک شراکت قائم کرتے ہیں تو اس میں جو شریک کم رقم ادا کر کے زائد رقم وصول کرتا ہے اس کی زائد رقم سود کہلاتی ہے۔

ہر تجارتی کاروبار۔ اور لین دین میں سود کا دخل ہے۔ سودی کاروبار کی ان تمام اقسام کو اسلام کائنات انسانی کی فلاح و بہبود کی خاطر ممنوع اور حرام قرار دیتا ہے۔ یہ سود کی لعنت دولت اور سرمایہ کو بعض افراد اور گروہ میں سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ ایک کو فائدہ اور دوسرے کو نقصان کا باعث بنتی ہے۔ سود کے دخل سے اقتصادی نظام تباہ و برباد ہو جاتا ہے یہ سود کی لعنت مختلف شکلوں میں لوگوں کے خون چوس کر ایک مخصوص جماعت کو دولتمند بنا دیتی ہے اور سرمایہ داری کا وجود قائم کرتی ہے۔ قرآن عظیم نے واضح الفاظ میں حکم دیا ہے:

"اے ایمان والو سود اور سود در سود کو ہرگز ذریعہ معاش نہ بناؤ۔ اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح حاصل کرو۔"

جس چیز کو اللہ تعالےٰ نے اپنے حکم سے حرام قرار دیا ہے، ایک اسلامی ریاست پاکستان میں اس کو رائج ہونے کی کیوں اجازت دی جاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ سود خور کی بدکرداری کو کسی حالت میں بھی معاف نہیں کرے گا۔ سود خور خدا اور خدا کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جنگ کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے سود کھانے والے، سود دینے والے اور سودی دستاویز لکھنے والے، گواہی دینے والے اور سودی کاروبار کی طرف مائل کرنے والے ان سب کو مجرم ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے اس لئے سود کے ذریعے کمائی ہوئی دولت بھی حرام ہے۔ سود اسلام کی نظر میں ظلم اور فساد کی جڑ ہے۔ سود خور کی کمائی ہوئی دولت سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ بدکردار اور بداخلاق ہوگی اور جرائم میں مبتلا ہوگی۔ موجودہ سماج کے جدید باطل نظام سے مرعوب مسلمانوں نے خدا تعالےٰ احکام سے ناآشنا یا بے پروا ہو کر بینک سسٹم کے سود کو پسند کیا ہے۔ انہوں نے دین اسلام سے غداری کی ہے۔ انہوں نے اپنی سرکشی اور بدبختی کی وجہ سے احکام الٰہی اور فرمان رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے بغاوت کی ہے۔ اسلام بنکوں، کمپنیوں کے سود کو بروئے شریعت ممنوع اور حرام قرار دیتا ہے۔ بینک دولت کو دولتمندوں میں محدود کرتا ہے اور غریب عوام کو غربت کی ہولناک بیماری میں مبتلا کرتا ہے اور عوام

کی تباہی پر دولتمندی کی بنیاد رکھتا ہے۔
سودی کاروبار سے پیدا کردہ سرمایہ داری انسانیت کی روح کو فنا و برباد کردیتی ہے۔ معاشی نظام میں سود کی آمیزش انکے اختلال کا باعث بنتی ہے۔ سود خور کے اندر سنگدلی اور زرپرستی جیسی عادات نشوونما پاجاتی ہیں جو دوسروں کے لئے تکالیف کا باعث بن جاتی ہیں۔ فریقین میں عداوت اور دشمنی پیدا کردیتی ہیں۔

حکومت پاکستان سے پُر زور التماس ہے کہ اس اسلامی ریاست پاکستان میں اسلام کا اقتصادی نظام بروئے کار لایا جاوے۔ موجودہ بینک سسٹم کو ختم کیا جاوے۔ بینکوں کا سودی کاروبار احکام شریعت کی کھُلی خلاف ورزی ہے۔ پاکستان میں ہر قسم کے سودی کاروبار کو ممنوع اور غیر شرعی قرار دیا جائے کیونکہ اسلامی ریاست میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان سود خور درندوں کو قانونی گرفت میں لایا جاوے۔ اگر بینک سسٹم کے وجود کو تسلیم بھی کرلیا جاوے تو ان کی ایسی شکل کا قیام وجود میں لایا جاوے جو اسلام کے منافی نہ ہو اور ان میں سود کے عمل کو کوئی دخل نہ ہو اور امداد باہمی کے ایسے طریقے رائج کئے جاویں جس میں سود کا کوئی عمل اور دخل نہ ہو۔ موجودہ دور کے بینک اور انشورنس کمپنیاں معاشرے کی خرابیوں کی ذمہ دار ہیں۔ کچھ لوگ جو دین اسلام سے گمراہ اور ناآشنا ہیں بینک کے سود کو منافع اور معاوضہ کی رقم تصور کرتے ہیں جو ان کی شدید ذہنی غلطی ہے۔ معاوضہ وہ ہے جس میں کمپنی کے طور پر چند افراد اپنا اپنا مال دے کر شامل ہوجائیں اور نفع و نقصان میں شریک ہوں۔ نفع وہ ہوتا ہے کہ کسی کاروبار میں مال لگانا اور نفع اور نقصان کا ذمہ دار ہونا۔ بے محنت روپیہ جو سود کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، معاشرے کے لئے بہت نقصان دہ ہے۔

تلخیص و مرسلہ: ن۔ع۔ شاہ بخاری

مسلمانوں میں اجتماعیت کا فقدان

صرف روس ہی نہیں امریکہ بھی عالم اسلام کیخلاف سازشوں میں شریک ہے (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

عالم اسلام کو درپیش مسائل اور افراتفری کے اسباب کے بارے میں پہلی اسلامی ایشیائی کانفرنس کے موقع پر مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے "زندگی" لاہور کے نمائندہ عبدالغنی فاروق کو ایک انٹرویو دیا جو کہ اس موضوع پر اہم تلخیص اور وضاحت کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

عالم اسلام کی گاڑی موجودہ دور میں اس لئے صحیح پٹڑی پر نہیں آرہی ہے کہ دینی قیادتوں میں جو جامعیت اور توازن قائم ہونا چاہیئے وہ نہیں ہے۔ دینی جماعتیں جب دکانیں بن جائیں تو ظاہر ہے اس میں تصادم ہوتا ہے۔ آج کا المیہ یہ ہے کہ بعض دینی جماعتیں دوسروں کو کام کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتیں اور ان پر حملہ آور ہوتی رہتی ہیں۔

اسلامی دنیا میں روس کی پیش رفت کے بارے میں سائل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا: صرف روس ہی نہیں امریکہ بھی عالم اسلام کے خلاف سازشوں میں شریک ہے۔ ان دونوں طاقتوں کی کوشش ہے کہ اسلامی دنیا میں کوئی صالح قیادت نہ ابھرنے پائے، لیکن اللہ کی سنت یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی زوال کی نظر نہیں ہوتے۔ اتحاد عالم اسلامی کیلئے میرے خیال میں اس راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ مخلصانہ خواہش کا فقدان ہے۔ اسلامی دنیا کے مختلف ملکوں میں ذاتی، جماعتی اور سیاسی مفادات حاوی ہوگئے ہیں، اجتماعیت کا جذبہ مفقود ہے اور قربانی و ایثار متروک ہوگئے ہیں۔ پھر کریڈٹ کا چکر بھی ہے۔ حکمران اس فکر میں رہتے ہیں کہ اگر اتحاد کی صورت پیدا ہو تو امارت کس کے پاس جائیگی، حالانکہ مقصد عزیز ہو تو ایسی باتیں درمیان میں نہیں آتیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو عین محاذ جنگ پر جرنیل کے عہدے سے معزول کردیا تھا مگر چونکہ دونوں طرف اخلاص تھا اسلئے کوئی خرابی پیدا نہ ہوئی۔ اور حضرت خالدؓ نے خاموشی سے سر اطاعت خم کردیا۔ عالم اسلام میں آج ایسا جذبہ ناپید ہے! اسلئے اتحاد کی منزل بہت دور نظر آتی ہے۔ اسلامی دنیا میں نسبتاً اسلامی نظام کیلئے سازگار ملک کے بارے میں بتایا کہ اگر آپ اسے رشوت یا خوشامد سے تعبیر نہ کریں تو میں کہوں گا "پاکستان" اسکی وجہ یہ ہے کہ میں نے پنجاب اور سرحد کے لوگوں سے زائد سادہ دل اور گرمجوش مسلمان اور کہیں نہیں دیکھے اگر انکی صحیح سیاسی تربیت ہو اور اسلامی شعور بیدار کردیا جائے تو یہ طاقتور ترین قوم ثابت ہوسکتی ہے۔ جفاکشی اور ایثار انکی سرشت میں ہے۔ پھر پاکستان ان علاقوں پر مشتمل ہے جہاں سید احمد شہیدؒ جیسے مصلح نے کام کیا ہے البتہ یہ اطلاعات ہمارے لئے بہت تشویش کا باعث ہیں کہ سندھ میں علاقائیت کا رجحان فروغ پذیر ہے۔ وہاں سندھی تحریک کو زندہ کرنے کی تحریکیں چل رہی ہیں اور راجہ داہر کو ہیرو کا درجہ دیا جارہا ہے حالانکہ یہی وہ سندھ ہے جو باب الاسلام ہے اور یہاں کے باشندے اسلامی تحریکوں میں پیش پیش رہے ہیں۔

خط وکتابت
کرتے وقت
خریداری نمبر
کا حوالہ ضرور
دیں ورنہ ہرگز
تعمیل نہ ہوگی

محمد سلیم قریشی

حافظ محمد لطیف
اسلام آباد

اسلامی نظامِ حکومت

بالغ رائے دہی اور حکمرانوں کا چناؤ

اسلام کا نظام حکومت صدارتی یا پارلیمانی۔ وحدانی یا وفاقی، مشاورتی یا مطلق العنانی۔ جمہوری یا آمرانہ۔ یک جماعتی یا دو جماعتی۔ اولی الامر کا انتخاب عوام کریں یا اہل الرائے (تعلیم یافتہ) اور متقی حضرات کریں۔

مسلمانوں کے حکمرانوں کا انتخاب بالغ رائے دہی کے ذریعے اکثریت کی بنا پر ہونا چاہیئے یا چند بااثر ورسوخ یا مقتدر افراد کی رائے یا پسند کے مطابق ہونا چاہیئے۔

اسلامی نظام کے تحت کسی عہدہ یا منصب کے لئے امیدواروں کو اپنے آپ کو پیش کرنا جائز ہے یا نہیں؟

اسلامی نظام میں ایک سے زیادہ سیاسی جماعتیں ہو سکتی ہیں یا نہیں؟

کیا اس وقت وہی ادارے اور طور طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں جو عہد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) یا خلافت راشدہ کے دوران موجود تھے، یا حالات و زمانہ کے تابع اسلام کے اصول اجتہاد کے ذریعے ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اگر تبدیلی ہو سکتی ہے تو کن اصولوں کے تحت کس حد تک اور کن مصالح اور کن مقاصد کے تحت ہو سکتی ہے؟

یہ تمام مسائل ایسے ہیں کہ اسوقت تقریباً ہر مجلس، ہر طبقہ اور ہر کس و ناکس کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ اہل علم و دانش حضرات میں سے بعض ممتاز حضرات نے تو یہاں تک دعویٰ کر دیا ہے کہ اسلام میں صرف ایک جماعت (حزب اللہ) کے علاوہ کسی دیگر جماعت کے وجود کا کوئی جواز نہیں اور اس سے اختلاف رائے رکھنے والے افراد کی اسلامی معاشرے میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس کی بنا پر عوام الناس کی اکثریت کے اذہان میں طرح طرح کے شکوک و شبہات ابھر رہے ہیں جس سے اسلام کے بارے میں یہ تاثر پیدا ہو رہا ہے کہ شاید عصر حاضر میں اسلام قابل عمل نہیں ہو سکتا۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس مہم میں ملک کے بعض اہم قومی اخبارات بھی پیش پیش ہیں اور اس بات کی وکالت کر رہے ہیں کہ عوام الناس کو اپنے حکمرانوں کے چناؤ کا اختیار ہی نہ ہونا چاہیئے۔

اسلام بلاشبہ مکمل ضابطہ حیات اور ایک عالمگیر فلاحی نظام ہے جو ہر زمانہ، قوم، وطن اور اقوام کے لئے کامل راہِ نجات ہے۔ اس میں ہر مسئلہ کا حل اور مرض کا مداوا موجود ہے، لیکن افسوس اس کو بروئے کار لانے کے لئے طبیب نہیں ملتا جو اس کے استعمال سے اس قوم بیمار کو صحت یاب ہونے کی راہ دکھا دے۔ اس پر اسوقت حکیمان حذاق کے بجائے عطائی حضرات اپنی دکانداری چمکا رہے ہیں۔ افسوس وہ بزرجمہر حضرات جو قومی وحدت کے نام سے یک جماعتی معاشرہ کا راگ الاپ رہے ہیں، وہ عوام کو اسلام کے قریب لانے کے بجائے اسلام سے دور کرنے کا باعث ہو رہے ہیں۔ مکمل رواداری کے حامل اور ہر قسم کے جبر و اکراہ سے پاک دین کو یک جماعتی معاشرہ کا حامی ثابت کر کے لوگوں میں اسلام کے بارے میں ذہنی انتشار پیدا کیا جا رہا ہے جو اسلام کی خدمت نہیں بلکہ عداوت ہے۔

پچھلے دنوں "شام ہمدرد" میں ان موضوعات پر مقالے بھی پڑھے گئے اور اخبارات میں اظہارِ خیال بھی کرایا گیا بلکہ چند ایک قومی اردو اخبارات نے تو اہل قلم علمائے کرام اور دانشوروں کا سوالنامہ کی صورت میں اس پر اظہار خیال شائع کرنے کا اہتمام بھی کیا۔ لیکن افسوس ان سے کسی ایک مقالہ نگار نے بھی صرف ایک آدھ پہلو پر سطحی سے دلائل کے علاوہ کوئی ٹھوس علمی یا تحقیقی بحث نہیں کی۔ حالانکہ راقم کے خیال میں یہ مسائل اتنے پیچیدہ ہیں نہ مشکل سوائے اس کے کہ یک جماعتی معاشرے کے حامی اصل میں جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ زبان پر لانے کی بجائے دل میں رکھ کر بات کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا مدعا کھل کر واضح ہونے کے بجائے مسئلہ کو اور زیادہ الجھا دیتا ہے۔

اسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی نوع انسان کے لئے اس کرہ ارض کے باسیوں

کے لئے آنے والی ہدایات کی آخری کڑی ہے۔ آفرینش آدم گویا پیدائش انسانیت تھی۔ جس طرح بچے کو کم سنی میں قدم قدم پر بڑوں کی راہنمائی اور نگہداشت کی احتیاج ہوتی ہے۔ اس طرح اس نونہالِ انسانیت کی اللہ تعالیٰ نے رہنمائی کے لئے ہادی اور راہنما بھی بھیجے جو اس کی ہر ہر ضرورت اور حالت میں پیشوائی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ عہد رسالت مآب (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تک پہنچ کر نوع آدم عہد شباب کو پہنچ گئی گویا ضرورت باقی نہ رہی۔ جس طرح جوان ہونے پر کسی کو بڑوں کی انگلی پکڑ کر چلنے کی ضرورت نہیں رہتی، کیونکہ یہ شعور کی وہ منزل ہے جب خود اپنی راہیں متعین کرنے کے لئے کسی عاقل بالغ شخص کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت صحت مندانہ اور صالح انداز میں ہوئی ہو۔ اس کے بعد اس کو کسی خارجی روشنی کی ضرورت رہتی ہے نہ پاسبانی کی۔ بس پاسبانِ عقل کے ساتھ نورِ ہدایت کا چراغ دے کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تکمیلِ مشن کے بعد بنی نوع انسان کو دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلنے کی ضرورت نہیں رہی۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی ہدایت کا مدار صرف دو ہی چیزیں قرار دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میرے بعد جب تک تم دو چیزوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تم کبھی بھی گمراہ نہ ہو گے"[1]

کتاب اللہ و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تا قیامت پیش آنے والے تمام حالات و حادثات کا احاطہ ممکن نہیں تھا۔ نہ ہی قیامت تک کی حیات انسانی کی تمام تر جزئیات کا تعین مناسب ہو سکتا تھا تاہم جو ضروریات اور اصول دین ہر زمانہ، قوم اور وطن کے لئے اٹل اور غیر متبدل تھے قرآن و سنت میں ان کا ذکر کر دیا گیا جو ضروریات اور اساسیات دیگر اس زمرے میں نہیں آتے تھے ان کا ذکر ضروری نہ سمجھا گیا۔ چنانچہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں واضح طور پر کہیں بھی یہ نہیں ملے گا کہ امت مسلمہ کو اپنے حکمرانوں کا چناؤ کیسے کرنا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلیفہ کے چناؤ پر انصار اور مہاجرین میں باہم اختلاف پیدا ہوا۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس امر کی بھی کوئی واضح ہدایات نہیں تھیں کہ فلاں آدمی کو خلیفہ مقرر کیا جائے، فلاں طریق پر اس کا انتخاب کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت امت مسلمہ نے اپنی صوابدید کے مطابق خلیفہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب کر لیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی وفات سے قبل حضرت عمر رض کو خلیفہ نامزد فرما دیا۔[3] حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اوپر قاتلانہ حملے کے بعد سات جلیل القدر صحابہ کرام رض کا ایک پینل نامزد کر دیا تھا جن میں سے خلیفہ کا چناؤ ہونا تھا۔[1] حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد مدینہ منورہ کے اصحاب الرائے نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ چن لیا۔[2] حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد اصحاب دار الخلافہ (کوفہ) نے آپ رض کے فرزند حضرت حسن رض کو آپ رض کا جانشین مقرر کیا جنہوں نے چھ ماہ تک خلافت چلا [illegible] امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سونپ دیا اس طرح خلافت راشدہ کے دوران یونان کی شہری ریاستوں کے طریق انتخاب کی طرح شہری مجمع گاہ میں چناؤ (حضرت ابوبکر رض اور حضرت علی رض کی تقرری) نامزدگی (حضرت عمر رض کی) استرائیہ (حضرت عثمان غنی رض) اور باپ کے بعد بیٹے کی جانشینی (حضرت حسن رض)

۱۔ لن تضلوا ما تمسکتم بهما کتاب اللہ و سنة رسوله (مشکوٰۃ حدیث نمبر ۵۵ ج ۱)

۱۔ ملاحظہ ہو تلویح ص ۵۰ (لا ادراج حکم کل حادثة فی القرآن)

۲۔ (أ) ملاحظہ ہو سیرت النبی ابن ہشام ص ۸۰۸، جلد ۲۔ "سقیفہ بنی ساعدہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر رض کے چناؤ کے بارے میں صحابہ کرام میں اختلاف پیدا ہو گیا۔"
(ب) ملاحظہ ہو تاریخ طبری و سیرت النبی ابن ہشام ص ۹۴۵، ۹۵۷

۳۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ حضرت ابوبکر رض نے (باقی حاشیہ کالم اگلا)

(بقیہ حاشیہ) حضرت عمر رض کی نامزدگی سے قبل بعض اہل الرائے اور جلیل القدر صحابہ کرام رض سے آپ رض کے خلیفہ بنانے کے بارے میں مشورہ کیا تھا، تاہم پھر یہ بھی کہیں نہیں ملتا کہ یہ مشورہ بہت زیادہ تعداد میں صحابہ کرام رض سے کیا گیا ہو۔ (ترجمہ تاریخ طبری جلد ۳ ص ۲۴۲)

۱۔ یہ اصحاب حضرت عثمان رض، حضرت علی رض، حضرت عبدالرحمن بن عوف رض، حضرت طلحہ رض، حضرت زبیر رض اور سعد بن وقاص رض تھے۔ ساتویں حضرت عبداللہ رض بن عمر تھے۔ حضرت عمر رض ان کے بارے میں یہ تصریح کر گئے تھے کہ مشورہ میں یہ شریک ہوں گے مگر امیدوار اقتدار خلافت نہیں ہوں گے۔ (ملاحظہ ہو سیرت خلفائے راشدین از معین الدین ندوی، طبری ج سوم، ص ۲۴۲، ۲۴۳)

۲۔ ملاحظہ ہو اگلا صفحہ

کا چناؤ اور دو حکمرانوں میں مصالحت (حضرت حسن رضؓ اور امیر معاویہ رضؓ کے ذریعے حکمرانوں کے تقرر کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اسلام نے اولی الامر کے چناؤ کے سلسلے میں کوئی ایک خاص متعین طریق کار نہیں بتایا نہ ہی کسی طریق کار کی ممانعت کی ہے بلکہ اس معاملہ کو ان معاملات کی طرح چھوڑ دیا ہے جس میں امت مسلمہ کی اکثریت حالات زمانہ اور ضروریات کے مطابق فیصلہ کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ اسلام کے کسی صریح حکم کے منافی نہ ہو، گویا یہ مسئلہ ہمارے لئے مباح[1] کے ذیل میں آتا ہے جس میں حسب ضرورت وقت اولی الامر کو فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

غیر مخصوص معاملات کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصول،

اس موقع پر اس امر کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زندگی بھر کا یہ معمول رہا کہ جب کسی چیز کے بارے میں قرآن میں کوئی حکم نہ ہوتا اس کے بارے میں صحابہ کرام رضؓ سے مشورہ فرماتے[1] چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ سے کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا کہ کسی معاملہ پر قرآن کا کوئی حکم موجود نہ ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضؓ سے مشورہ کئے بغیر اپنی رائے صحابہ کرام رضؓ پر ٹھونسی ہو۔ معاملات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضؓ سے مشورہ کئے بغیر کبھی عمل نہیں کیا[1]، بلکہ "وشاورھم فی الامر" کے الفاظ اس امر کے شاہد ہیں کہ مشاورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا معمول نہیں تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے مامور تھے۔ نہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود صحابہ کرام رضؓ سے غیر مخصوص معاملات میں مشورت ضروری سمجھتے تھے بلکہ صحابہ کرام رضؓ کو بھی اس کی پابندی کی تاکید کرتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت علی رضؓ کو عامل یمن بنا کر بھیجا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ سے استفسار فرمایا: جب تمہارے پاس کوئی تصفیہ طلب معاملہ آیا تو اس کا فیصلہ تم کیسے کروگے؟ تو حضرت علی رضؓ نے جواب دیا کہ "کتاب اللہ سے"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر اس کا جواب اس میں نہ ہو تو!" حضرت علی رضؓ نے جواب دیا: "سنت سے"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

(بقیہ حاشیہ) خلفائے راشدین از معین الدین ندوی و تاریخ طبری جلد سوم صفحہ ۲۴۲، ۲۴۳

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: "عن سلیمان الفارسی: الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرمہ اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ فھو مما عفی عنہ وفی روایتہ ما احل اللہ فی کتابہ فھو حلال وما حرمہ فھو حرام وما سکت عنہ فھو معفو فاقبلوا من اللہ عافیتہ رواہ ابن ماجہ والترمذی"۔

[1] قرآن کریم میں "وشاورھم فی الامر" آل عمران (اے پیغمبر علیہ السلام) آپ ان رضؓ سے معاملات حکومت میں مشورہ کیا کیجئے کے الفاظ بصیغہ امر آئے ہیں۔

اسی طرح سورہ شوریٰ میں "وامرھم شوری بینھم" ان (مسلمانوں) کے معاملات شوریٰ سے چلتے ہیں' کے الفاظ حقیقت حال کے شاہد ہیں جن سے خود اس امر کی تصدیق کردی ہے کہ مسلمانوں کے باہمی فیصلے مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ ادنیٰ سمجھ کا مالک بھی اس بات کے سمجھنے سے عاری نہیں ہو سکتا کہ جب باری تعالیٰ گواہی دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کے امور مشورہ سے طے پاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ چند افراد کی رائے کا اس معاشرہ میں سکہ چلتا ہے حضرت ابوہریرہ رضؓ کا بیان ہے کہ ماراَیت احدا اکثر مشورہ لا صحابی من النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ترمذی الجہاد) بخاری شریف (کتاب السنۃ فتح الباری ج ۱۳ صفحہ ۲۸۶)۔

حضرت قتادہ کا قول ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منجانب اللہ حکم تھا کہ اہم معاملات (امر) میں اپنے اصحاب سے مشورہ کیجئے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم کی قوت و تاکید کو محسوس فرماتے اور اس کی تعمیل لازمی سمجھتے تھے۔ حضرت عائشہ رضؓ بھی فرماتی ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ لوگوں سے رائے اور مشورہ لینے والا کوئی انسان نہیں دیکھا"۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے تحریری طور پر (باقی حاشیہ کالم اگلا)

(بقیہ حاشیہ) حضرت عمر رضؓ کو ہدایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شوریٰ پر عامل تھے "تم بھی لازماً اس پر عمل کرنا" ضحاک کا بیان ہے کہ فاروق اعظم رضؓ نے عورتوں کو بھی حق رائے دہی دیا تھا اور وہ معاملات میں ان کی رائے بھی لیتے تھے۔ (اسلام کا نظام حکومت - از مولانا حامد الانصاری الانصاری صہ ۳۰۲، ۳۰۳

[1] مثلاً مقام بدر کا انتخاب، اسیران بدر سے سلوک، ہدیہ سے کران کی رہائی اور جان بخشش (باقی حاشیہ صفحہ اگلا)

نے فرمایا اگر ایسی کا جواب اس میں نہ ہوا ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً خود ہی رہنمائی فرمائی کہ ایسی صورت میں تم وہاں کے اہل بصیرت حضرات کے مشورہ سے اس کا حل تلاش کرنا ؎

مشورت کے سلسلے میں

خلیفہ اول رض کا طریق کار

حضرت ابو بکر صدیق رض نے اپنے عہد خلافت میں امور خلافت کے سلسلے میں جہاں قرآن و سنت سے کوئی ہدایت نہ ملتی وہاں مجلس شوریٰ سے مشاورت فرماتے ۔ مثلاً جمع قرآن مجید، اپنی تنخواہ کا تعین اور اس طرح کے دیگر معاملات میں جہاں قرآن و سنت کی کوئی رہنمائی نہ تھی آپ رض نے صحابہ کرام رض سے باقاعدہ مشورہ کیا ؎

اسی طرح حضرت عمر رض کے عہد میں بھی حضرت ابو بکر صدیق رض کی طرح عمل ہوتا رہا ۔ مثلاً محصول چنگی کے نفاذ، حد شراب بندی میں اضافہ اور عراق کی مفتوحہ زمینوں کے حق ملکیت کے مسئلہ کے علاوہ متعدد دیگر امور کے بارے میں ایسی مجالس مشاورت برپا ہوئیں ؎

(بقیہ حاشیہ) جنگ خندق کے موقع پر مقابلہ کہاں اور کیسے کیا جائے ۔ جنگ احد کہاں لڑی جائے شوریٰ حدیبیہ۔ شوریٰ افک شوریٰ اسیران بنی ہوازن شوریٰ اذان شوریٰ معاذ بن جبل (اسلام کا نظام حکومت ص ۳۰۷)

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ ایسے معاملات میں جو مسلمانوں کے عام معاملات سے متعلق ہوتے تھے اور جن میں وحی کی ہدایت موجود نہ ہوتی مسلمانوں سے مشورہ کرتے مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جنگ کے موقع پر اور جنگ کے بعد پیش آنے والے حالات میں اور حکومت کے دوسرے معاملات میں جن میں کوئی نص نہ ہوتی مسلمانوں سے مشورہ کرتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حکومت راشدہ کے دور میں بھی صحابہ کرام رض نے ایسا کیا۔ (خلافت کے مسئلہ میں جمہور کا مسلک "ترجمان القرآن ج ۶۰ شمارہ ۳ ۱۹۶۳ء"

؎ ملاحظہ ہو حوالہ ذیل فقہ الاسلام از حسین احمد الخطیب ص ۲۲ اردو ترجمہ) حضرت سعید (باقی حاشیہ اگلا کالم)

(بقیہ حاشیہ) بن المسیب حضرت علی رض سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رض نے فرمایا کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ ہمارے سامنے ایسا مسئلہ درپیش ہوتا ہے جس کا ذکر کتاب و سنت میں موجود نہیں ہوتا ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسی صورت میں عالم اور عابد مسلمانوں کو جمع کرو اور اس معاملے کو ان کے سامنے مشورہ کے لئے پیش کرو اور کسی ایک کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

؎ امام بغوی میمون بن مہران کی اس روایت کا ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رض کے سامنے جب مقدمات پیش ہوتے تھے تو ان کے فیصلے کے لئے وہ کتاب اللہ کا مطالعہ کرتے تھے اگر وہاں کوئی حکم مل جاتا تھا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے اور اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہیں ملتا تھا تو اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث مل جاتی تھی تو وہ رض اس کے مطابق فیصلہ صادر فرماتے تھے ۔ لیکن اگر وہاں بھی کوئی مسئلہ نہ ملتا تھا تو آپ رض مسلمانوں سے پوچھتے تھے کہ میرے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کیا تمہیں اس بارے میں کوئی حدیث معلوم ہے ؟ اس سوال کے جواب میں بعض اوقات سب مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث بیان کرتے تھے ، مگر (باقی حاشیہ اگلا کالم)

(بقیہ حاشیہ) بعض دفعہ کوئی حدیث نہیں ملتی تھی تو آپ رض بہترین اہل الرائے اور اہل علم کو جمع کرتے ان سے مشورہ کرتے تھے ۔ جب وہ کسی بات پر اتفاق کر لیتے تھے تو آپ رض اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے ۔ (ایضاً ص ۲۲۱)

حضرت صدیق اکبر رض کے زمانے کے چند اہم واقعات شوریٰ درج ذیل ہیں:

۱۔ جیش اسامہ کے بارے میں لوگوں کی رائے لی گئی۔

۲۔ شوریٰ مانعین زکوٰۃ ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو صدیق اکبر رض نے اس معاملہ کو بحث کے لئے رائے عامہ کے سامنے پیش کیا۔ (ایضاً)

؎ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے تقرر کے بارے میں آپ رضی اللہ عنہ نے مجلس حکومت سے مشورہ کے بعد معاملہ عامۃ المسلمین کے سامنے پیش کیا ۔ علاوہ ازیں جمع قرآن اور مرتدین سے جنگ کے بارے میں آپ کے مشورہ کا ثبوت ملتا ہے۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں عراق کی مفتوحہ زمینوں کی تحویل کے بارے میں صحابہ کرام اور عامۃ المسلمین سے مشورہ کیا ۔ بیت المقدس کا سفر کرنے کے بارے میں (باقی حاشیہ اگلا کالم)

سطورِ بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں اربابِ اقتدار کے چناؤ کا کوئی ایک خاص طریق متعین نہیں، بلکہ یہ سب کچھ حالاتِ زمانہ کے مطابق ملتِ مسلمہ پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ خلافتِ راشدہ کے دوران خلیفہ کے چناؤ کے سلسلے میں کسی نہ کسی طریق پر عوام کی تائید حاصل کر لی (بذریعہ بیعت خواہ خلیفہ کے زمامِ اختیار سنبھالنے کے بعد ہی ہوئی ہو) جاتی تھی۔ اموی اور عباسی ادوار میں خالصتاً نامزدگی اور موروثی سلسلہ جاری ہو گیا[۱] اور علمائے کرام یا فقہائے عظام کے معمول سے اختلاف رائے یا بسا اوقات حکومت کے ساتھ عدم تعاون[۲] کے علاوہ کوئی خاص قابلِ ذکر اختلاف کا ثبوت نہیں ملتا، بلکہ اس کے برعکس علمی اور دینی حلقوں میں اکثریت ایسے اصحابِ علم و دانش کی رہی ہے جو خلیفہ وقت (خواہ اس نے اقتدار پر غاصبانہ ہی قبضہ کیا ہو) کے اقتدار مستحکم ہونے کی صورت میں اس کے خلاف خروج کو ناپسندیدہ بلکہ ناجائز قرار دیتی ہے۔ عباسی دور کے بعد مملکت اسلامیہ مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ سلجوقی، غزنوی، غوری، فاطمی، مغل، مملوک، عثمانی وغیرہ کسی بھی خاندان کی ملوکیت کے خلاف کبھی کوئی اجتماعی کاروائی ہوئی نہ ہی کوئی فتویٰ دیا گیا۔ حتیٰ کہ عصرِ حاضر کے دوران یزید بن معاویہؓ کی نامزدگی کو منہاجِ سنت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔

بقیہ دیگر خلفائے راشدین حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے عہد میں بھی ایسے شورائی فیصلوں کا ثبوت ملتا ہے (ملاحظہ ہو اسلام کا نظامِ حکومت صـ ۳۰۸ تا صـ ۳۱۱)

[۱] امتِ مسلمہ کو یزید کی نامزدگی پر اعتراض ضرور ہوا اور وہ بھی شاید اس لئے کہ اس کے مقابلے میں جناب حسینؓ جیسی ہستی تھی ورنہ بعد میں اقتدار کے امیدواروں یا گروہوں میں جنگوں یا مناقشوں کے سوا کبھی کوئی خاص مؤثر احتجاج نہیں ہوا۔

[۲] عدم تعاون حکومت میں کوئی عہدہ قبول کرنے سے انکار کی صورت میں اور وہ بھی بعض درویش منش اور اقتدار و جاہ سے زیادہ نفور رکھنے والے فقہاء کرام کی طرف سے مثلاً امام ابو حنیفہؒ نے خلیفہ منصور کی طرف سے قاضی القضاۃ کے عہدہ (باقی حاشیہ اگلا کالم)

(بقیہ حاشیہ) کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا (ملاحظہ ہو سیرت النعمان از شبلی نعمانی ص ۸۷ - ۹۴، امام ابو حنیفہؒ عہد و حیات از ابوزہرہ اردو ترجمہ رئیس احمد جعفری مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور، نیز امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی از مناظر احسن گیلانی صـ ۴۱۱) اگر کوئی شخص بغیر مشورہ امام بن جائے تو اس کی اطاعت فرض ہو گی۔ اس مسئلہ پر جمہور کا خیال ہے کہ اگر پہلے سے مسلمانوں کا کوئی امام نہ ہو اور کوئی ان کے نظمِ حکومت پر غالب آ جائے تو وہ امام تسلیم کر لیا جائے گا بشرطیکہ اس میں امانت کے اوصاف ہوں اور لوگوں کے درمیان عدل قائم کرے اور لوگ بھی اس سے راضی ہوں اور اس کی بیعت کر لیں۔"

"امام مالکؒ کے نزدیک بیعت سے پہلے آزادانہ انتخاب کوئی شرط نہیں بلکہ وہ بیعت کو شرط تسلیم نہیں کرتے ان کے خیال میں لوگوں کی رضامندی اور اقامتِ حق خلافت کے لیے کافی ہے۔"

"امام شافعیؒ کا بھی خیال تھا وہ رضائے حق کو کافی سمجھتے تھے۔ سالم سے ان کے شاگرد حرملہ نے روایت کی ہے کہ ہر قریشی جو خلافت پر تلوار کے زور سے غالب آ جائے اور اسے لوگوں کی تائید حاصل ہو جائے وہ قانوناً خلیفہ ہے۔ چنانچہ شوافع کے نزدیک قرشیت، عدالت اور رضائے عامہ ہی کو (باقی حاشیہ اگلا کالم)

(بقیہ حاشیہ) خلافت میں اصل اہمیت حاصل ہے، خواہ رضا بیعت سے پہلے ہو یا بعد میں۔"

امام احمدؒ کہتے ہیں کہ جسے خلیفہ بنایا گیا اور لوگ اس پر متفق اور راضی ہو گئے وہ خلیفہ ہے اور جو ان پر تلوار کے زور سے غالب آ گیا اور خلیفہ بن بیٹھا وہ بھی خلیفہ ہے۔

امام احمدؒ کا یہ بھی قول ہے کہ جو مسلمانوں کے امام کے خلاف بغاوت کرے، درآنحالیکہ لوگ اس پر متفق ہو چکے ہوں اور اس کی خلافت تسلیم کر چکے ہو خواہ خوشی کے ساتھ یا بالجبر تو اس باغی نے جماعت کا شیرازہ منتشر کیا اور ارشادِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کی۔ اگر باغی اس حال میں مر جائے تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔ چنانچہ جمہور فقہا کا خیال ہے کہ متغلب کی خلافت، خلافتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اگر امامت کی دوسری شرطیں اس میں پوری ہوتی ہوں اور ان شرطوں میں سب سے اہم عدالت ہے" خلافت کے مسئلے" میں جمہور کا مسلک۔" از استاذ ابوزہرہ (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جلد ۶۰ صفحہ ۱۶۲، ۱۹۶۳ء شمارہ اپریل)

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں بالحق (DEJURE) امام اگر میسر نہ ہو تو بالفعل (DEFACTO) جو بھی مسلمانوں کا امام ہو اس کے تحت مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا نظام چلے گا۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ اگلا)

سے انحراف بلکہ مکروہ اور مذموم بدعت قرار دیا گیا؎ حقیقت تو یہ ہے کہ اب بھی امتِ مسلمہ کے کسی اجتماعی فیصلے کے تحت کسی شاہی حکومت کو غیر اسلامی نہیں قرار دیا گیا ہے؎ نہ ہی کبھی ایسی ملوکیت کے خلاف اس ملک کے عوام نے کوئی تحریک چلائی نہ ہی عالم اسلام کے کسی فورم سے ایسی کوئی آواز بلند ہوئی ماسوائے اس کے کہ بعض ممالک میں فوجی انقلابوں کے ذریعہ رفتہ رفتہ ملوکیتی نظام کی بساط لپیٹی جا رہی ہے اور یہ کہ ایران کے شہنشاہ کے خلاف تحریک کے روحانی قائد جناب آیت اللہ خمینی کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ اسلام میں ملوکیت کا کوئی جواز نہیں۔ اسی طرح حالاتِ زمانہ کے تحت جمہوری تحریک یا سوشلزم وغیرہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) خواہ بجائے خود اس امام کی امامت جائز نہ ہو۔ (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن جلد ۶۰ شمارہ ۵، ص ۸۴-۲۸۳ شمارہ اپریل ۱۹۶۳ء "مسئلہ خلافت میں ابو حنیفہؒ کا مسلک" از استاذ ابو زہرہ)

؎ اگرچہ خوارج کے خلفائے وقت کے خلاف خروج کے واقعات ملتے ہیں لیکن وہ امت مسلمہ کا بہت ہی محدود گروہ تھے اس لئے ان کی بغاوت کو مجموعی طور پر مسلمانوں کے نظام حکومت کے خلاف بغاوت متصور نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا اختلاف زیادہ تر خلیفہ وقت کے عقائد سے ہوتا تھا۔ (راقم)

؎۲ ملاحظہ ہو "خلافت و ملوکیت" از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم۔ "تحریک تجدید و احیائے دین" (باقی حاشیہ اگلا کالم)

؎۳ کس قدر ستم ظریفی ہے (باقی حاشیہ اگلا کالم)

کے فروغ سے بعض ممالک کے عوام نے بھی بادشاہتوں کے خاتمے کے لئے آوازیں اٹھانی شروع کر دی ہیں یا حکومتوں کے تختے الٹنے کے اسباب پیدا کئے ہیں، لیکن کسی مذہبی ادارہ یا پلیٹ فارم کی طرف سے اس سلسلے میں قطعاً کوئی آواز نہیں اٹھائی جا رہی۔

اصل بات یہ ہے کہ خلفائے راشدہ کے بعد عالم اسلام میں اب تک ملوکیت کے خلاف اگر کبھی آواز اٹھی تو اس کی وجہ زیادہ تر برسرِ اقتدار افراد کے ذاتی اعمال و کردار کے ناپسندیدہ ہونے کی وجہ تھی۔ اگر کوئی نیک اور رعایا کا خیرخواہ حکمران پیدا ہو گیا خواہ ملوکیتی نظام کے تحت وہ برسرِ اقتدار آیا ہو۔ اس نے زبردستی یا غاصبانہ طور پر اقتدار حاصل کیا ہو اس کو بھی امت نے "السلطان العادل فی الارض ظل اللہ"

(بقیہ حاشیہ ؎۲) میں تو مولانا مرحوم نے تو حضرت امیر معاویہؓ سمیت دورِ اموی کو "جاہلی حکومت" سے تعبیر کیا بلکہ مزے کی اصل بات تو یہ ہے کہ چودھویں صدی کے آخری ربع میں سعودی ملوکیت کی انکو خود سرپرستی حاصل رہی۔ غالباً ان کے نزدیک حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت اس وقت کی سعودی حکومت سے بھی گئی گذری ہے۔ یہ جانے مولانا مرحوم نے سعودی ملوکیت کی طرف سے اسلامی خدمات کے صلہ میں شاہ فیصل ایوارڈ اور چھ لاکھ روپے کا انعام وصول کرتے وقت حضرت عثمانؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کی طرف سے مسلمانوں کے بیت المال کو بلادریغ استعمال کرنے کے "جرم" کو معاف کیا یا نہیں۔ (راقم)

بقیہ حاشیہ ؎۳ : کہ دنیائے عرب کی بہت سی ایسی (باقی حاشیہ اگلا کالم)

کے خطاب سے نوازا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام میں خاندان بنو امیہ کو جہاں ایک طرف ملوکیت ایسے ظالمانہ اور آمرانہ نظام کی بنیاد ڈالنے پر برا بھلا کہا جاتا ہے اسی نظام کے تحت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور کو خلافتِ راشدہ کا دور بھی شمار کیا جاتا ہے۔

سطورِ بالا میں کی جانے والی بحث کا لب لباب یہ ہے کہ اسلام میں طرزِ حکومت اور حکمرانوں کے چناؤ کا مسئلہ اجتہادی ہے جو ہر عہد اور زمانہ کے لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے اولی الامر کا چناؤ کر لیں، بلکہ شاید یہ کہنا بھی نا موزوں نہ ہو گا کہ خواہ کوئی حکمران کسی طریقہ سے بھی برسرِ اقتدار آیا یعنی بزورِ شمشیر، ملوکیت کے تحت، لوگوں کی اکثریت کی تائید سے، انقلاب کے ذریعے یا کسی دیگر طریقے سے، اگر اس نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ملتِ مسلمہ، انسانیت اپنے عوام اور اسلام کی بہتری کے لئے کام کیا تو امت کے علماء اور اہلِ دانش نے اس حکمران کی اطاعت ضروری قرار دی اور اس کے خلاف بغاوت کو ناجائز قرار دیا؎

طرزِ حکومت اور حکمرانوں کے چناؤ کا مسئلہ اجتہادی نوعیت کا ہے تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس کو طے کرنے کا مجاز کونسا طبقہ ہونا چاہیئے۔

(بقیہ حاشیہ) حکومتوں کی طرف سے مولانا مرحوم کو تاحیات سرپرستی حاصل رہی ہے جو خود ملوکانہ طرز کی ہیں۔ (راقم)

؎ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کے حکمرانوں میں کئی فرمانروا نہایت خونریزی بلکہ دھوکہ دہی کے ذریعہ برسرِ اقتدار آئے۔ اقتدار پر (باقی حاشیہ اگلا کالم)

اسوقت مسلمانوں کا ایک طبقہ اس بات کا قائل ہے کہ حکمرانوں کا چناؤ خلافت کی طرز پر ہونا چاہیئے اور چناؤ کے سلسلے میں رائے دہی (ووٹ) کا حق ہر کس وناکس کو نہیں ہونا چاہیئے جو صاحب علم وتقوی ہوں یا کسی خاص معیار تک تعلیم یافتہ ہوں۔ یا بعض دینی فرائض کی پابندی کرتے ہوں۔ ان کے نزدیک ایک ان پڑھ جاہل شخص اور اعلی تعلیم یافتہ مثلاً پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر، عالم دین، قانون داں یا جج کی رائے اسی طرح ایک پڑھے لکھے نوجوان اور ایک پڑھے لکھے کمسن سالہ تجربہ کار جہاندیدہ بزرگ کی رائے کی اصابت ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔

دوسرے طبقے کا خیال ہے کہ اس وقت دنیا اتنی ترقی کر چکی ہے کہ عام زندگی کے مسائل اور حکمرانوں کے چناؤ کا مسئلہ اتنا دقیق یا مشکل نہیں رہ گیا جس کے لئے کسی خاص معیار کی تعلیم یا استعداد کا ہونا لازمی ہو۔ اسوقت سلطانیٔ جمہور کا زمانہ ہے، دنیا بھر میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر حکمرانوں کا چناؤ ایک تجربہ شدہ چیز ہو گئی ہے۔ اسوقت دنیا کے اکثر تقریباً تمام ممالک میں ایک بالغ شخص کو اپنے جملہ معاملات کے بارے میں مجاز اور با اختیار متصور کیا جاتا ہے۔ بیاہ شادی، معاملات، کاروبار، معاہدات الغرض ہر حیطہ کار میں اگر ایک عاقل، بالغ اور صحیح الدماغ شخص کی رائے کی بنا پر مشاغل چل رہے ہیں۔ ایسے اشخاص کے حکمرانوں کے چناؤ کے بارے میں فیصلے کیونکر نا قابل اعتماد ہو سکتے ہیں۔

راقم الحروف کے نزدیک مسلمانوں کے حکمرانوں کے چناؤ اور طرز حکومت کے بارے میں عوام کی اکثریت کی رائے کو ہی قابل اعتماد ہونا چاہیئے اور بالغ رائے دہی کی بنیاد اور مغربی جمہوریت کی طرز پر مسلمانوں کی اکثریت کی رائے کے مطابق اس کا فیصلہ خلاف اسلام نہیں بنتا۔ اس کے لئے بندہ کے دلائل درج ذیل ہیں۔

۱۔ جمہور عربی لفظ ہے جسکا معنی اکثریت ہے۔ جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جس میں حکمرانوں کے چناؤ اور حکمرانی کے بارے میں اہم فیصلے کسی علاقہ کے جمہور عوام کی منشاء کے مطابق طے ہوتے ہیں۔ امریکہ کے ایک سابق صدر ابراہیم لنکن نے جمہوری حکومت کی جو تعریف کی ہے کہ "عوام کی حکومت، عوام کی بھلائی کے لئے اور عوام میں کے لوگوں کی رائے کے مطابق کے اصول کا اسلام سے تصادم نہیں ہوتا۔

۲۔ حضرت ابوبکر اور علی رضی اللہ عنہما کے چناؤ کے وقت اس بات کی قطعاً کوئی شہادت نہیں ملتی کہ آیا سقیفہ بن سعدہ کا داخلہ صرف محدود اہل الرائے کے لئے کھلا تھا اور عوام الناس کو اس میں جانے سے روکا گیا تھا۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کبھی صحابہ کرامؓ سے کسی مسئلہ پر مشورہ طلب فرمایا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسوقت کسی خاص قسم کا اجتماع منعقد نہ کیا جس میں صرف محدود اہل الرائے کو اظہار رائے کرنے کی اجازت دی گئی اور عوام الناس کو اس کے بارے میں رائے دہی سے روکا گیا۔ حقیقتاً صورتحال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کوئی شوریٰ کا اجلاس بلایا ہی نہیں بلکہ جب کبھی کوئی مسئلہ اٹھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسوقت بلا امتیاز اعلیٰ وادنیٰ، امیر وغریب، اقرب و ابعد سب صحابہ کرام کے سامنے اسے پیش کیا، مثلاً جنگ بدر کے قیدیوں سے سلوک کا مسئلہ ہو یا خندق کھودنے کا مسئلہ تمام موجودہ حضرات کو اظہار خیال کا حق حاصل تھا اور صحابہ کرامؓ کی اکثریت نے جو فیصلہ کیا اس پر عمل کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کبھی کسی گمراہی پر مجتمع (الخیال) نہیں ہو گی[1] اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرمایا کہ جس چیز کو مسلمانوں کی اکثریت اچھا خیال کرے وہ چیز احسن ہے[2]

۴۔ ایک اور مقام پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "سواد اعظم کے ساتھ رہنا لازم پکڑو"[3]

(بقیہ حاشیہ) فائز ہونے کے بعد انہوں نے دین اسلام اور لوگوں کی بھلائی کی پالیسی اپنائی تو اسکو دینی حلقوں کی طرف سے پاسبان عقیدہ تک کہا گیا۔ مثلاً شاہجہان اپنے بھائی شہریار کو قتل کر کے برسر اقتدار آیا۔ اورنگزیب اپنے دو بھائیوں دارا شکوہ اور مراد بخش کی نعشوں پر برسر اقتدار ہوئے۔

[1] لا تجتمع امتی علی الضلالہ او قال ان اللہ لا یجمع امتی (امۃ محمد) علی ضلالہ ویداللہ علی الجماعۃ۔ (مشکواۃ باب الاعتصام۔ حدیث نمبر ص ۱۶۴)

[2] ماراہ المسلمون حسنا فھو عنداللہ حسن وماراہ المسلمون قبیحا فھو عنداللہ قبیح" بعض محدثین کے نزدیک یہ حدیث ہے جیسا کہ آمدی نے الاحکام جلد ۱ ص ۱۱۲ میں کہا ہے لیکن بعض کے نزدیک یہ حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول ہے۔ ملاحظہ ہو مقاصد حسنہ لسخاوی کتاب السنہ جلد ۱ شرح حموی علی الاشباہ" جلد ۱ ص ۱۲۷ اور شرح المجامع ص ۳۰۸ بحوالہ فلسفہ شریعت اسلامیہ ص ۱۷۹

[3] اتبعوا سواد الاعظم فانہ من شذ شذ فی النار (مشکواۃ شریف جلد ۱ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص ۵۲)

اس ضمن میں خلیفہ وقت کی طرف سے علمائے وقت کی موجودگی میں اپنے

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"جو شخص سیدھا راستہ ظاہر ہونے کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے ہوئے ایسی راہ اختیار کرے گا جو مسلمانوں کی نہیں تو ہم اسے متوجہ رکھیں گے اس طرف جس طرف وہ متوجہ ہوا ہے داخل کریں گے اسے جہنم میں جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔" [1]

آیت کریمہ مذکورہ میں مسلمانوں کا راستہ کہ کر اللہ تعالیٰ نے یہ بات بالکل صاف کر دی ہے۔ ظاہر ہے مسلمانوں کا راستہ وہی ہو سکتا ہے جس پر مسلمانوں کی اکثریت چل رہی ہو نہ کہ چند افراد اس پر چل رہے ہوں۔

۷۔ اسلام نے احکام کے سلسلے میں عرف کو بہت اہمیت دی ہے یعنی عرف کے وہ تمام رسوم ورواج جو حکمت الٰہی کے (منفعت عوام اور دفع مضرت وتنگی اور حرج) موافق تھے وہ سب قبول کر لئے گئے حتی کہ غیر صوب علاقوں کے عرف کو بھی مسترد نہ کیا خواہ وہ کسی ملت، مذہب یا قوم سے متعلق رہے ہوں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرف ہے کیا چیز؟ فقہاء کرام نے عرف کی یہ تعریف کی ہے کہ ایسا فعل یا عمل جسکو کسی علاقے کی اکثریت مستحسن قرار دیتی ہو [1] عرف کو کسی قوم کا تعامل یا عادت بھی کہا جاتا ہے [2] چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے (اے پیغمبر) عفو ودرگزر سے کام لیجئے، عرف کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے منہ پھیرئیے [3] اسی طرح عرف کے بارے میں فقہ کا اصول ہے کہ جو چیز عرف سے ثابت ہے وہ نص سے ثابت کے مثل ہے۔ [4]

فقہاء کرام نے مفتیان حضرات کے لئے یہ اصول طے کر دیے ہیں کہ وہ پیش آمدہ مسائل کے سلسلے میں عرف زمانہ کا لحاظ رکھیں خواہ وہ متقدمین کے موقف کے خلاف ہی ہو [1] حتی کہ عرف کے خلاف فتویٰ ناجائز قرار دیا گیا ہے [2] اور عرف عام کا فیصلہ نص کے فیصلہ کے مانند قرار دیا گیا ہے [3] اور لوگوں کے دستور کو حجت قرار دے کر اسے واجب العمل قرار دیا گیا ہے [4] اسلام نے جس عرف وعادت زمانہ کو اسقدر زیادہ اہمیت دی ہے وہ عرف وعبادت وہی فعل یا عمل ہو سکتا ہے جس پر عوام الناس کی اکثریت عامل ہو۔ محض کسی مخصوص طبقہ یا اہل الرائے کی پسند کو عادۃ الناس قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے اس کیلئے عوام الناس کی اکثریتی رائے اور پسند ہی اسی کا مدار اور معیار قرار پائے گی۔

مندرجہ ذیل دلائل سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ "سبیل المومنین" وہی طریقہ ہو سکتا ہے جس پر فرزندان توحید کی اکثریت رواں دواں ہو۔ حدیث کی رو سے عرف اسی راستہ کو "عصمت امۃ" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور عرف اسی فعل کو معروف کہا جا سکتا ہے جس کی اتباع اسلامیان کی اکثریت کر رہی ہو کوئی ایک گروہ یا چند اشخاص خواہ کسی قدر اہل علم وبصیرت اور زہد وتقویٰ ہوں ان کی رائے کو عصمت عن الخطاء حاصل نہیں ہو سکتی اسی طرح کوئی علمی مسئلہ ہو یا دنیاوی معاملہ اس کے

(بقیہ حاشیہ) بیٹوں کی جانشینی کے لئے جواز کی دلیل میں اپنی مشہور تصنیف "احکام السلطانیہ" میں جناب ماوردی لکھتے ہیں کہ "سلیمان بن عبدالملک نے عمر بن عبدالعزیز کو ان کے بعد یزید بن عبدالملک کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ اگر مسلمانوں کے پاس ایسا کرنے کی دلیل نہ بھی ہوتی تو بھی اس کے ایسے معاصر علمائے تابعین کا جواز کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کو خاطر میں نہیں لاتے اس کو منظور کر لینا ہی اس کے جواز کی دلیل ہوتا۔ ہارون الرشید نے اپنے زمانے کے علمائے امت سے مشورہ کر کے اپنے تینوں بیٹوں امین مامون اور مؤتمن کو ترتیب وار ولیعہد بنایا۔" (ص ۱۲۰ اردو ترجمہ)

[1] ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدی (باقی حاشیہ اگلا کالم)

(بقیہ حاشیہ) ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولی ونصلہ جہنم وساءت مصیرا۔ سورہ نساء آیۃ ۱۱۶

[1] عادۃ جمہور قوم فی عمل او قول (لغزالی)

[2] (الف) النعامن وهو عادة الناس فی المعاملات البیع والشراء غیرهما

[3] خذ العفو وأمر بالعرف واعرض عن الجهلین۔ (سورہ اعراف آیت ۱۹۹)

[4] الثابت بالعرف کالثابت بالنص الثابت بالعرف کثابت بدلیل شرعی (شرح زرقانی جلد ۱ صفحہ ۱۱۵)

[1] ان یفتی علی عرف اهل زمانه وان خالف زمان المتقدمین۔ (رد المختار)

[2] انما تعتبر العادة اذا اضطردت او غلبت (الاشباہ والنظائر لسیوطی ص ۶۵)

[3] ملاحظہ ہو المجلۃ الاحکام لعدلیہ (دفعہ ۴۵)

[4] ملاحظہ ہو بقیہ حاشیہ اگلا صفحہ

رپورٹ: حافظ گلزار احمد آزاد

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور تحریک پاکستان

تحریک پاکستان کے عظیم راہ نما شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی دینی و قومی خدمات پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے بزم عثمانی گوجرانوالہ نے بلدیہ گوجرانوالہ کے جناح ہال میں ۱۳ فروری کو "شیخ الاسلامؒ کانفرنس" کا اہتمام کیا۔ کانفرنس کے مہمان خصوصی وفاقی وزیر تعلیم الحاج محمد علی خان ہوتی تھے اور ان سے پاکستان بار کونسل کے سیکرٹری اقبال احمد خان ایڈووکیٹ، مولانا زاہد الراشدی، پاکستان رائٹرز گلڈ پنجاب کے سیکرٹری ارشد میر ایڈووکیٹ، مولانا حکیم عبدالرحمٰن آزاد، مولانا گلزار محمد توحیدی اور الحاج سید امین گیلانی نے خطاب کیا۔ کانفرنس کی صدارت بزم کے سرپرست اعلیٰ الحاج لالہ عبدالعزیز نے کی اور شیخ الہندؒ سوسائٹی کے صدر حافظ گلزار احمد آزاد نے سٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیے۔

اقبال احمد خان نے نوجوانوں کو تلقین کی کہ وہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے نقش قدم پر چلیں اور قیام پاکستان کے مقصد کی تکمیل کے لئے مخلصانہ جدوجہد کریں۔

ارشد میر نے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ مرحوم ایک حق گو اور صاحب بصیرت عالم دین تھے جن کا عظیم کارنامہ تحریک پاکستان کی حمایت میں سرگرم کردار ہے۔

مولانا زاہد الراشدی نے کہا کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے رفقاء نے تحریک پاکستان میں جو عظیم کردار ادا کیا اس کا سب سے بڑا اعتراف یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد ملک کا پرچم کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے لہرایا۔

مولانا حکیم عبدالرحمٰن آزاد نے کہا کہ بزرگوں کی یاد کا مقصد محض رسم کو پورا کرنا نہیں ہوتا بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ ہم ان کی تعلیمات اور مشن کو زندہ کریں اور جس مقصد کے لئے انہوں نے جدوجہد کی ہے اس کی تکمیل کے لئے پرخلوص کوشش کریں۔

مہمان خصوصی جناب الحاج محمد علی خان ہوتی نے کانفرنس میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی خدمات اور شخصیت پر مفصل روشنی ڈالی۔ ان کی تقریر کا متن درج ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

شیخ الاسلام علامہ سید شبیر احمد عثمانیؒ کی یاد کے سلسلے میں حاضری دینا میرے لئے دین و دنیا کی عزت، برکت اور فخر حاصل کرنے کا موقع ہے۔ اس اعزاز پر میں منتظمین حضرات کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

حضرت علامہ عثمانیؒ ایک ذی علم گھرانے کے چشم و چراغ تھے جنکا شجرۂ نسب حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ سے جا ملتا ہے۔ عربی زبان و ادب اور علم دین کی تحصیل دیوبند سے کی جہاں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ جیسے اساتذہ کی توجہ انہیں نصیب ہوئی۔ اردو اور فارسی زبان و ادب کی تعلیم اس سے پہلے حاصل کر چکے تھے۔

دیوبند کے دورۂ حدیث میں آپ نے اول انعام حاصل کر کے مدرسہ فتح پوری دہلی سے آپ نے تدریس علم دین کا آغاز کیا۔ یہیں آواز ملک گیر ہوئی۔

حضرات! مولانا مرحوم کی ذات ایک عجیب جامع کمالات کا مجموعہ تھی۔ تفسیر قرآن جس روشن دماغی کے ساتھ ان کے قلم سے نکلی وہ انہی کا حصہ ہے۔ حدیث نبویؐ

پر وہ ایک مستند عالم کا درجہ رکھتے تھے۔ فقہ اسلامی اور دیگر دینی مسائل میں ان کی رائے اور دلیل ان دونوں میدانوں میں روشنی کا درخشاں مینار ہے۔ فلسفہ اور منطق آپ کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے۔ انہی علوم اور وسیع علوم پر بس نہیں۔ علامہ عثمانیؒ کی زندگی اردو۔ فارسی اور عربی میں یادگار رہنے والی تقاریر کا ایک طویل سلسلہ ہمارے لئے چھوڑ گئی ہے جن تقاریر میں مذہب و علم الکلام ہی نہیں خالص ادب اور ملکی اور عالمی سیاست کے بھی بے لاگ جائزے اور مباحث ملتے ہیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے علاوہ ان کے رفقائے کار مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا شبیر علی تھانویؒ، مولانا محمد شفیع دیوبندیؒ جیسے علمائے کرام کی خدمات بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے علامہ عثمانیؒ کے شانہ بشانہ کام کیا اور اپنے علوم و افکار سے دنیا کو منور کیا۔ ظہور پاکستان سے قبل علامہ اقبالؒ جیسی عظیم ہستی میں جو کمال ظاہر ہوا تھا وہی کمال اور ویسی ہی ہمہ جہت وسعت علامہ شبیر احمد عثمانی اور ان کے رفقائے کار میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ صورتحال زندگی اور علم کو یقین کی کسوٹی پر پرکھنے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ ان حضرات نے علم کو عشق اور یقین کی منزل سے گزارا تب انہیں علم کے باطن میں اترنے اور پھر اپنی روح میں اتار کر بصیرت پانے کا وہ مقام حاصل ہوا جسے اہل اللہ "علم الیقین" کے مقدس نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ وہی میدان عمل اور وہی مقام سلوک ہے جسے مولانا رومیؒ نے یوں یاد کیا ہے

علم را بر دل زنی یارے بود

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے ساتھی اپنے روحانی تجربے کو دلیل اور منطقی اظہار کا جو کمال بخشتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کی تقاریر سننے والا مخالف ذہن بھی نہ صرف اس موضوع پر متفق ہو کر اٹھتا تھا بلکہ اپنے ذہن کے گوشوں میں تجلیات علم کا ایک جہان ساتھ لے کر آتا۔ ۱۳۴۴ھ میں شاہ سعود نے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو حرمین شریفین آنے کی دعوت دی جہاں ان کی عربی تقاریر کی دھوم مچ گئی۔ "قرآن کی تفسیر اور حدیث مسلم کی شرح" دو ایسے عظیم الشان علمی کارنامے ہیں جو مولانا کے نام اور کام کو رہتی دنیا تک لافانی کرنے کے لئے کافی ہیں، مگر اس عظیم دانشور نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جس طرح علم کو علم الیقین کی منزل پر پہنچا کر اس کی تصدیق کی تھی اسی طرح اپنے تصدیق شدہ علم کو اپنے عمل کے لئے روشنی بھی بنایا۔ یہاں سے وہ عظیم زندگی شروع ہوتی ہے جس کا داخل اس کا خارج ہوتا ہے اور جس کا ظاہر باطن کی ہو بہو تصویر بن جاتا ہے۔ جنگ بلقان کا واقعہ، تحریک خلافت سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں جن میں آپ کی توانا اور فعال شرکت شامل رہی۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ۴ جون ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں ارباب لیگ کو تبلیغ کی غرض سے جو وفد بھیجا آپ نے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو اس وفد کا امیر مقرر فرمایا۔ یہاں سے ان کی باقاعدہ سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ جب آپ نے دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دے کر باقاعدہ تحریک پاکستان میں حصہ لینا شروع کیا اور فرمایا کہ:

کانگریس کے دائرہ میں جہاں ہندو عناصر کے کھلے ہوئے غلبے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا مٹھی بھر مسلمان داخل ہو کر تو یہ امید کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے معاملات میں ان سب کو راہ راست پر لے آئیں گے لیکن مسلم لیگ کے متعلق جو خاص مسلمانوں کی جماعت ہے کیا اس امید کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ یہ چیز کم از کم میری سمجھ سے باہر ہے۔ مسلم لیگ کلمہ گو مسلمانوں کی جماعت ہے۔ اس میں ہزاروں عیب سہی تاہم غیر مسلم قوموں کی نسبت تو ہم سے قریب تر اور مفید تر ہے۔ اگر مسلم لیگ ناکام ہوئی تو قوی اندیشہ ہے کہ ایک سچا اصول ہی ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائے اور مسلمانوں کے قومی و سیاسی استقلال کی آواز فضائے ہندوستان میں پھر کبھی سنائی نہ دے۔ پاکستان ایک ایسا ابتدائی قدم ہے جو انجام کار قرآنی اصول کے مطابق احکم الحاکمین کی حکومت عادلہ قائم ہونے پر کسی وقت منتہی ہو سکتا ہے۔"

(عصر جدید کلکتہ ۲۱ جون ۴۵ء

مولانا کے اس بیان سے ہوا کا رخ بدل گیا۔ جو لوگ ابھی تک مسلم لیگ کی حمایت کے لئے آمادہ نہ ہو سکے تھے وہ اس میں شامل ہو کر اس کے معاون و مددگار بن گئے۔ پاکستان کے نام پر لڑے جانے والے الیکشن قریب آ گئے تھے۔ مخالفین کی طرف سے اس قسم کا پروپگنڈہ کہ "مسلم لیگ بے دین امراء کی نمائندہ ہے اسے جماعت علماء کی تائید حاصل نہیں ہے"۔ ادھر ارباب لیگ بری طرح محسوس کر رہے تھے کہ جب تک ہر محاذ پر علماء ان کے شانہ بشانہ کام نہ کریں الیکشن جیتنا آسان کام نہیں۔ چنانچہ ان کے تقاضے پر حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ملک کے مقتدر علماء کرام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا محمد طاہر قاسمیؒ، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، مولانا ابو برکات عبدالرؤف دانا پوری، مولانا آزاد سبحانی، مولانا غلام مرشد خطیب جامع عالمگیری نے ۷ نومبر ۱۹۴۵ء میں کلکتہ میں جمع ہو کر ایک عظیم الشان علماء کانفرنس منعقد کی اور جمعیۃ علماء اسلام کا سنگ بنیاد رکھا جس کے صدر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ منتخب کئے گئے۔ اس کانفرنس نے متفقہ طور پر مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کیا اور ایک قرارداد

کے ذریعے مسلم ووٹروں سے اپیل کی کہ مسلم لیگ کے نمائندہ کے سوا کسی دوسری جماعت کے نمائندہ کو ووٹ دینا اتحادِ ملت، مفادِ ملت اور استقلال اسلام کے مقاصد کے خلاف ہے۔

پاکستان کے سوال کا فیصلہ بڑی حد تک ان انتخابات کے نتائج پر موقوف تھا۔ مولانا کی سرکردگی میں یہ علماء کرام ملک کے طول و عرض میں مسلم لیگ کی امداد اور پاکستان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے پھیل گئے جن کی مساعی جمیلہ سے کانگریس کے نمائندے کے مقابلے میں نوابزادہ لیاقت علی خان جیت گئے۔ یہ جمعیۃ علماء اسلام کی پہلی شاندار کامیابی تھی اور مسلم لیگ کی عظیم الشان فتح تھی۔

یکم دسمبر ۱۹۴۵ء کو مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند دہلی دیوبند تشریف لائے اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو ان کے ارادے سے ہٹانے کے لئے گفتگو کا آغاز کیا۔ جس کے جواب میں علامہ عثمانیؒ نے فرمایا کہ:

"میں نے جو رائے پاکستان کے متعلق قائم کی ہے وہ خلوص پر مبنی ہے۔ جمعیۃ علماء اسلام قائم رہے یا نہ رہے میری رائے جب بھی یہی رہے گی کہ مسلمانوں کے لئے پاکستان مفید ہے۔ مسلمانوں کو ایک مرکز اور ایک پلیٹ فارم پر ہونا چاہیئے اور علماء ملت کو اس کی پشت پناہی اور اصلاح میں جدوجہد کرنی چاہیئے۔

دوسرا سوال کہ میں ہمیشہ کے لئے سیاست سے کنارہ کشی کر لوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس الیکشن کی اہمیت دوسرے انتخابات سے مختلف ہے۔ چونکہ اس الیکشن سے قوموں کی قسمت کا فیصلہ وابستہ ہے اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس بنیادی موقع پر مسلمانوں کی امداد کی جائے جو استقلال ملت اور مسلم حق خود ارادیت کے حامی ہیں۔ آپ کی خواہش ہے کہ میں ایسے موقع پر نرمی یا سکوت اختیار کر لوں لیکن جس چیز کو میں حق سمجھتا ہوں ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں میرے لئے سکوت کیسے ممکن ہے۔" (   )

وفد کے لاجواب ہو جانے پر اس گفتگو کا الٹا اثر یہ ہوا کہ علامہ عثمانیؒ کے موقف کو اور تقویت مل گئی اور انہوں نے ۲۶ دسمبر ۱۹۴۵ء کو دیوبند کے ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

"اگر حصول پاکستان کے لئے میرے خون کی ضرورت ہوئی تو میں اس راہ میں اپنا خون دینا باعث افتخار سمجھوں گا اور اس سے ہرگز دریغ نہیں کروں گا۔ اس لئے کہ میری ملت اسلامیہ کا وجود، بقا اور مسلمانوں کی عزت اور زندگی قیام پاکستان سے وابستہ ہے۔ میں اپنی زندگی کو کامیاب سمجھوں گا اگر اس مقصد کے لئے کام آ جاؤں۔"

(حیاتِ محمد علی جناح ص۴۵۸)

اسی جدوجہد کے زمانہ میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو ایک دوست نے خط لکھا جس میں درج تھا کہ میں نے خواب میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کو دیکھا جو مجھے ایک چمکدار تلوار عطا کرتے ہوئے ارشاد فرما رہے ہیں کہ "عزیزم تم دیوبند جا رہے ہو میں تمہیں یہ تلوار دیتا ہوں وہاں پہنچ کر میرا یہ تحفہ بعد سلام مسنون شبیر احمد عثمانیؒ کو دے دینا۔" اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔ علامہ عثمانیؒ نے یہ واقعہ سنا کر فرمایا کہ بھائی مسلم لیگ کی فتح یقینی ہے۔ یہی وہ مجددی تلوار ہے جس نے اکبر کے دین الٰہی کو فنا کے گھاٹ اتارا تھا۔ اب انشاء اللہ اسی مجددی حربہ سے کانگریس کی قومیت متحدہ اور گاندھی ازم کو موت کی نیند سلا دیں گے۔

نئے حالات کا جائزہ لینے کے لئے جب ۹ جون ۱۹۴۵ء کو دہلی میں مشترک ہندوستان کی اسمبلی کے مسلم ممبران کا اہم اجتماع ہوا تو اس میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کو خاص طور پر مدعو کیا گیا جہاں اصولی طور پر پاکستان کو قبول کر لیا گیا جس سے تاریخ ہند میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اپنے دوسرے رفقائے کار مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی کے ساتھ قائد اعظمؒ کے پاس مبارکباد دینے کے لئے حاضر ہوئے تو قائد اعظم نے فرمایا کہ:

"مولانا یہ مبارکباد آپ کو ہے کہ آپ ہی کی کوششوں سے کامیابی ہوئی ہے۔"

اس کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح نے مولاناؒ کی توجہ سرحد اور سلہٹ کے ریفرنڈم کی طرف دلائی اور اس پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے اور کہا کہ سرحد پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور سلہٹ کا علاقہ بھی مشرقی پاکستان کے لئے ایسا ہی ہے۔ اس پر مولانا عثمانیؒ نے فرمایا کہ انشاء اللہ ہم ریفرنڈم ضرور جیت لیں گے، بشرطیکہ آپ یہ اعلان کر دیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام جاری ہوگا اور اس کا دستور اسلامی ہوگا کیونکہ سرحد اور سلہٹ کا مسلمان سیاسی مصالح کو نہیں جانتا، وہ صرف اسلام کو جانتا ہے اور اس کے نام پر ووٹ دے سکتا ہے۔" اس کے جواب میں قائد اعظم نے فرمایا کہ مولانا میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ پاکستان کا دستور اسلامی ہوگا، اور آپ بھی میری طرف سے اعلان کرتے رہیں کہ پاکستان کا نظام حیات اسلامی ہوگا۔ چنانچہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے سرحد اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے سلہٹ کا محاذ سنبھالنے کا ذمہ لے لیا۔ اس ملاقات کے فوراً بعد کانگریسی لیڈروں نے ریفرنڈم جیتنے کے لئے

پختونستان کی تحریک شروع کر دی۔ نیز ۲۳ جون ۱۹۴۷ء خان ملک اکبر علی خان آف بنوں کی قیامگاہ پر سرحد کی کانگریس پارٹی خدائی خدمتگار اور آزاد قبائل کے وزیر اور محسود پٹھانوں نے بھی شرکت کی؛ جس کی صدارت خان امیر محمد خان صدر کانگریس کمیٹی صوبہ سرحد نے کی جس میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ تمام پختونوں کی ایک آزاد ریاست کا اعلان کیا جائے۔ دوسری طرف سرحد میں عرصہ سے سرخپوش تحریک چل رہی تھی۔ خدائی خدمتگار سارے صوبہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ وہ حالات تھے جن میں مسلم لیگ کو ریفرنڈم لڑنا تھا اور جن کی وجہ سے قائداعظم اتنے پریشان تھے اگرچہ مولانا عثمانیؒ کو یقین تھا کہ وہ اسلام کے نام پر یہ محاذ بھی جیت لیں گے، مگر حق تعالےٰ نے ان کی حوصلہ افزائی کے لئے انہیں اس متوقع فتح کی بشارت بھی دے دی تھی۔ جب علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فرنٹیر کا تفصیلی دورہ کیا تو ان کی شبانہ روز مساعی سے عوام مسلم لیگ کی حمایت پر آمادہ ہو گئے، اور اس طرح سے سلہٹ کا میدان مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے ہاتھ رہا اور سرحد میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو کامیابی ہوئی اور یہ دونوں صوبے پاکستان میں شامل ہو گئے۔ اس تاریخی اور شاندار فتح نے قائداعظم کے مشن کی تکمیل کر دی اور جب ۲۷ رمضان المبارک یعنی ۱۴ اگست ۴۷ء بروز جمعۃ المبارک جشن پاکستان منایا گیا تو ملک کی سب سے بڑی ہستی یعنی قائداعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان نے علماء ربانی کی تاریخی خدمات کے اعتراف کے طور پر پاکستان کی پرچم کشائی کا اعزاز علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کو بخشا۔ کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے تلاوت کلام پاک کے بعد مختصر تقریر کے ساتھ اپنے متبرک ہاتھوں سے آزاد پاکستان کا پرچم آزاد فضا میں لہرا کر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کو اسلامی ممالک کی برادری میں شامل کرنے کی رسم کا افتتاح کیا۔ پاکستانی فوج نے پرچم پاکستان کو پہلی سلامی دی اور سب نے مل کر یہ ترانا گایا

اونچا رہے نشان ہمارا"

حضرات محترم!

ملک کا تصور دینے والے فلسفی حضرت علامہ اقبالؒ ملک کے طور پر ممکن بنانے والے عظیم مدبر جناب قائداعظم اور قائد ملت کے بعد اس ملک پر جس کا ذاتی احسان ہے اور یہ خطہ زمین جس کی کوششوں سے مجتمع ہوا وہ شخصیت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ۱۹۴۰ء سے شروع ہونے والے عشرے میں جب تشکیل پاکستان کے سلسلے میں لاہور میں قرارداد منظور ہوئی تو برصغیر کے مسلمانوں کے قلوب پر بڑے بڑے مذہبی علماء کا سکہ چلتا تھا جو سب کے سب پاکستان کے مخالف تھے انہوں نے نہ صرف پاکستان کی مخالفت کی بلکہ سواد اعظم کی مخالفت کی۔ واحد عالم دین جو مسلم مملکت کے لئے مخالفت کے اس سمندر میں کود گئے تھے وہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تھے یا پھر ان کے رفقائے کار مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا شبیر علی تھانوی، اور مفتی محمد شفیع تھے جنہوں نے انکا ساتھ دیا اور جن کی مساعی جمیلہ سے پاکستان معرض وجود میں آیا۔ شاید حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے لئے ہی ارشاد فرمایا تھا کہ

"علماء امتی کانبیاء
بنی اسرائیل

(ترجمہ) میری امت کے علماء
کی حیثیت بنی اسرائیل کے انبیاء
کی سی ہے۔"

حضرات! علامہ مرحوم کا ذوق عمل یہاں تک نہیں رک جاتا بلکہ انہوں نے جس پاکستان کا خواب دیکھا تھا اسے صحیح معنوں میں اسلامی فلاحی ریاست کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پاکستان کی دستور سازی کے سلسلے میں انتہائی خلوص قلب اور جانفشانی سے ایک آئینی سفارش ترتیب دی جس کے بارے میں سر ظفر اللہ تک کو یہ کہنا پڑا کہ

"میں نے سب کے
بنائے ہوئے آئینی مسودے
دیکھے لیکن میں یہ کہے
بغیر نہیں رہ سکتا کہ علامہ
شبیر احمد عثمانی سے بہتر
آئین کسی نے ترتیب
نہیں دیا۔"

فروری ۱۹۴۹ء میں آپ نے ڈھاکہ میں دستور سازی کی کانفرنس میں جو خطبۂ صدارت دیا اس نے اس بنیادی ڈھانچے کی بنیاد فراہم کر دی جسے بعد میں لیاقت علی خان نے قرارداد مقاصد کے نام سے پاکستان کی دستوری اساس کے طور پر دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا اور جس کی بنا پر بعد میں دستور پاکستان بنا۔

خواتین و حضرات!

یہ ایک جائزہ تھا اس زندگی کا جو ایک مومن کی زندگی تھی جسے خدا نے اپنے ایک پسندیدہ ملک کے قیام، بقا اور اس کی نظریاتی سمت کے تعین کے لئے چن لیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت شیخ الاسلام کو خود اس ذمہ داری کا کسقدر احساس تھا، فرماتے ہیں:

"ہمارا عقیدہ ہے کہ تقدیر نے ہمیں پاکستان کے تحفظ کے لئے انتخاب کیا ہے اور یہ چیز آئندہ نسلوں کو ورثے میں ملے گی۔ امروز شاید ہمارا مذاق اڑائے لیکن ہماری آنکھیں صبح فردا کے اس دلفریب خندہ کا نظارہ کر رہی ہیں جس کے پردے سے ہماری کامرانیوں کا (باقی صـ پر)

مؤذنِ اوّل

حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالےٰ عنہ

اس دور کی سب سے بڑی ضرورت "اتحاد" ہے اور ملک و ملت کی سب سے بڑی خدمت بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کے ایسے فرقوں کو جو محض فروعی اختلافات جو قرنِ اوّل (عہد صحابہؓ) کے دور سے چلے آرہے ہیں ان کے دوران رواداری پیدا کرکے ان سب کو ایک دوسرے کے قریب تر لایا جائے تاکہ انما المومنون اخوۃ کے فرمان مقدس کے مطابق دلوں کے بُعد اور باہمی دوریاں ختم ہوکر ازسرِنو ملک و ملت کی خدمات مشترکہ طور پر انجام دی جاسکیں۔ اس مقصد عظیم کے حصول کے لئے ضرورت ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات زندگی سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کی جائے اور ان کے سب طور طریقے اپنائے جائیں، اس لئے کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"البتہ ضرور میری امت پر بھی وہ دور آئے گا جس طرح بنی اسرائیل پر آیا تھا۔ جس طرح (ایک انسان کا) ایک پاؤں کا جوتا دوسرے پاؤں کے جوتے کے برابر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں سے ہمبستری کی ہوگی تو میری امت میں بھی ایسا ہی ہوگا جو یہ کام کرے گا اور تحقیق بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹے گی۔ سوائے ایک فرقے کے باقی سب دوزخ میں جائیں گے۔ دریافت کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنتی گروہ کونسا ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس طریقہ پر میں اور میرے صحابہ کرامؓ ہیں۔" (ترمذی شریف)

شرح مواقف میں ان ۷۳ فرقوں کے عقائد اور ان کے نام تک بھی درج ہیں، مگر ہم کسی کی دلآزاری نہیں کرتے بلکہ صحابہ کرامؓ کے مختصر حالات زندگی آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ دعا ہے کہ رب کائنات ہم کو صحابہ کرامؓ کے عین نقش قدم پر چلنے اور عمل کی توفیق بخشے۔

ایں از من و از جملہ جہاں آمین باد

حضرت شہید فی سبیل اللہ سید محمد اسمٰعیل شہیدؒ نے "اللہ اللہ فی اصحابی الخ۔۔۔" والی مشہور حدیث جو اکثر جمعہ کے خطبات میں بھی بیان کی جاتی ہے کے فوائد میں لکھا ہے کہ:

"حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ دو بار امت کو تاکید کی اور چھ مرتبہ فرمایا کہ لوگو میرے اصحابوں کے مقدمہ میں کوئی بات طعن اور طنز کی ان کے حق میں تمہاری زبان سے نہ نکلے اور ایسا نہ کیجیو کہ تم میرے بعد میرے یاروں کو نشانہ بناؤ اور ان پر بولیاں مارو اور طعن ان کی طرف متوجہ کرو، بلکہ ان سے محبت رکھیو اس واسطے کہ وہ میرے یار ہیں، ہم صحبت اور ہمنشیں ہیں۔ میرا لحاظ کرکے ان سے محبت اور دوستی رکھو۔ یہ قاعدہ مشہور ہے کہ دوست کا دوست اپنا بھی دوست ہوتا ہے۔ سو میرے اصحابؓ میرے دوست ہیں تو جس نے ان کو دوست رکھا تو ان کو میری ہی محبت کے سبب دوست رکھا اور اپنے دوست کا دشمن بھی اپنا دشمن ہوتا ہے اور میرے اصحابؓ میرے دوست ہیں تو جو شخص ان سے بغض اور دشمنی رکھے تو وہ شخص مجھ سے ہی دشمنی رکھتا ہے، اور جس نے میرے اصحابوں کو ایذا دی، اس نے گویا مجھ کو ہی ایذا دی، اور جس نے مجھ کو ایذا دی اس نے گویا اللہ تعالےٰ کو ہی ایذا دی، اس لئے کہ میں اللہ تعالےٰ کا

حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں اور جس نے اللہ تعالےٰ کو ایذا دی وہ چند دنوں کے لئے کافروں کی طرح آرام سے رہے گا مگر آخر کو اللہ تعالےٰ اس کو گرفتار کرے گا اور سزا دے گا۔ اللہ تعالےٰ کو ایذا پہنچانا یہی ہے کہ اس کے حکم کے خلاف کرے اور اس کے محبوبوں کو ایذا پہنچا دے۔"

ایک اور مشہور حدیث جس کا ترجمہ یہ ہے:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں نے پوچھا اپنے رب سے اختلاف کا حال اپنے بعد کا تو وحی آئی کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تیرے اصحابؓ میرے نزدیک ایسے ہیں جیسے آسمان کے تارے بعض سے بعض قوی تر ہیں، مگر ہر ایک میں روشنی ہے تو جس نے اختیار کیا اس روش کو جس پر وہ اصحابؓ ہیں ان کے طرح طرح کے رستوں میں سے تو وہ میرے نزدیک نیک راہ ہے:"

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ ایک لاکھ سے زیادہ تھے۔ ان میں بعض کے مزاج میں گرمی اور بعض کے مزاج میں نرمی زیادہ پائی جاتی تھی۔ کسی کو قرآن کریم کا شوق بہت تھا، کسی کو روزے کا کسی کو جہاد کا، کسی کو گوشہ نشینی کی فکر کسی کو نصیحت اور وعظ سے تعلق خاطر کسی کا سکوت اور خاموشی معمول تھا، کسی کو مسائل بہت زیادہ یاد تھے کسی کو کم، کسی کا گھر روم میں کسی کا فارس میں، اور کسی کا حبشہ میں۔ آنحضرت علیہ السلام کی زندگی ہی میں دور دور سے آکر لوگ اسلام قبول کر رہے تھے، مگر جن کی قسمت میں خرابی تھی وہ گھر میں بھی محروم ہی رہے بقول کسے ؎

سلمانؓ از فارس بلالؓ از حبش صہیبؓ از روم
زخاک مکہ ابولہب ایں چہ بوالعجبی ست

اسلام کے سب سے پہلے مؤذن

حضرت بلال بن ابی رباح رضی اللہ تعالےٰ عنہ جو مسجد نبوی کے ہمیشہ مؤذن رہے۔ آپؓ ایک کافر کے غلام تھے قسمت اچھی تھی اسلام کی دولت عظمیٰ سے مشرف ہوئے تو بڑی بڑی تکالیف میں مبتلا کئے گئے۔ امیہ بن خلف جو اسلام کا بدترین دشمن تھا وہ حضرت بلالؓ کو سخت گرمی میں تپتی ہوئی ریت پر بالکل سیدھا لٹا کر آپؓ کے سینہ مبارک پر بڑی بھاری پتھر کی چٹانیں رکھ دیتا تھا کہ آپؓ اس بڑی تکلیف میں حرکت نہ کر سکیں۔ آپؓ کے گلے میں رسی باندھ کر وہ کافر اور کفار کے لڑکے باری باری زمین پر گھسیٹتے رہتے تھے۔ ایسی حالت میں کہا جاتا کہ اسلام سے باز آجاؤ مگر پھر بھی آپؓ کی زبان مبارک سے احدؐ احدؐ (خدا ایک ہے خدا ایک ہے) نکلتا تھا۔ آپؓ کو رات کے وقت زنجیروں سے سخت جکڑ کر بڑی بے رحمی اور سختی سے کوڑے لگائے جاتے تھے پھر ان کوڑوں کے زخموں کو گرم زمین سے داغ دیا جاتا تھا تاکہ بیقراری میں اسلام سے کسی طرح اس دیوانۂ رسول علیہ السلام کو پھیرا جا سکے مگر آپ علیہ السلام کا یہ عاشق صادقؓ یہ سب جور وستم برداشت کرتا اور ہر وقت احدؐ احدؐ کا وظیفہ پڑھتا۔ ابوجہل نے بھی بڑی کوشش کی مگر کفار کے یہ ظلم وستم بے کار ثابت ہوتے رہے۔ ایک بار یہ منظر سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے دیکھا تو آپؓ تڑپ اٹھے۔ سخت ناگوار ہوا کہ اسلام کے ایک شیدائی اور عاشق صادق کو اس طرح ظلم کا نشانہ بنایا جائے اس لئے آپؓ نے دو ہزار اشرفیاں کچھ اور سامان اور ایک غلام حضرت بلالؓ کے بدلے میں دے کر خرید لیا اور پھر آپؓ کو آزاد کر دیا۔ جب حضرت نبی کریم علیہ السلام کو یہ علم ہوا کہ آج ابوبکر صدیق رضؓ نے بلالؓ کو خرید کر آزاد کر دیا ہے تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کو یعنی صدیق اکبرؓ کو بہت بہت دعائیں دیں۔ اب حضرت بلالؓ آزاد تھے۔ آپؓ کو مسجد نبوی میں اذان دینے کے لئے مقرر کیا گیا تو آپؓ پانچوں وقت خلوص اور حضور قلب کے ساتھ اذان دیتے تھے۔ جب حضرت نبی کریم علیہ السلام معراج کے لئے تشریف لے گئے اور آپ کو جنت و جہنم کی سیر بھی کرائی گئی تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جب میں جنت کی سیر کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ بلالؓ مجھ سے بھی بہت پہلے جنت میں موجود ہے۔ دریافت کیا کہ اے بلالؓ تو نے دنیا میں ایسا کون سا عمل شروع کر رکھا ہے جس کے سبب آج میں تم کو اپنے آگے آگے دیکھتا ہوں۔ عرض کیا حضرت دو رکعت تحیۃ الوضو مستقل طور پر ضرور پڑھتا ہوں۔"

علماء نے لکھا ہے کہ حضرت بلالؓ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جنت میں پہلے جانا ایسا ہے جیسے خادم مخدوم سے پہلے جائے واردات پر پہنچتا ہے نہ بلحاظ مرتبہ کے۔ چونکہ حضرت بلالؓ حبشی تھے اس لئے اپنے ملک کی زبان دانی کے باعث حرف "ش" کو صاف نہیں پڑھتے تھے۔ "اشہد" کی بجائے "اسہد" پڑھا کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کیا کہ اے اللہ کے سچے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) عربی نہ ہونے کے باعث "ش" کو صحیح ادا نہیں کر سکتے۔ کفار اذان سن کر مذاق اڑاتے ہیں کہ ایسے لوگ آپ کے حلقہ میں ہیں جو زبان دان بھی نہیں، اس لئے بہتر ہے کہ کسی اور صحابیؓ کو اس دینی خدمت پر مامور فرمایا جائے۔ اس لئے حضرت بلالؓ کو اس خدمت سے موقوف کر دیا گیا اور کسی صحابیؓ کو مقرر کیا گیا۔ اس نے اذان دی۔ "مولانا" فرماتے ہیں ؎

گفت ہاتف بازار بانگ بلال رضؓ
خوش شدے بر عرش اعلیٰ ذوالجلال

یعنی حضرت بلالؓ جب اذان دیتے ہیں تو انؓ کی آواز عرش معلی تک جاتی ہے۔ خداوند کریم معہ ملائکہ مقربین خوش ہوتے ہیں تو اس کے بعد حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کو اس خدمت کے لئے مقرر منتخب فرما دیا۔ حضرت بلالؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر خوراک بھی تھے۔ خود فرماتے ہیں کہ یہ خدمت میرے سپرد تھی جس کی صورت یہ ہوا کرتی تھی کہ کوئی مسلمان بھوکا پیاسا آتا تو حضرتؐ مجھے ارشاد فرماتے تو میں کہیں سے قرض لیکر اس مسلمان بھائی کو کھانا کھلاتا۔ کسی کے پاس کپڑا پہننے کو نہ ہوتا تو ارشاد ہوتے ہی کہیں سے قرض لے کر اسکو کپڑا مہیا کر دیتا۔ یہی صورتحال تھی۔ اس دوران بروایت حضرت بلال رضؓ ایک مشرک آپؓ کو ملا۔ اس نے خود ہی حضرت بلال رضؓ کو کہا کہ میرے پاس دولت دنیا ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اگر ضرورت پڑتی ہو تو مجھ سے قرض لے لیا کرو۔ اس پر حضرت بلال رضؓ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس مشکل دور میں نجات کی ایک عمدہ صورت نکل آئی ہے۔ پھر حضرتؓ اس آدمی سے قرض لے کر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور فرمان کے مطابق مسلمانوں کی خدمت کرتے رہے۔ فرماتے ہیں کہ:

ایک بار وضو کر کے میں اذان دینے کے لئے کھڑا ہوا ہی تھا کہ وہی مشرک ایک جماعت کے ساتھ آیا اور بڑے رعب سے کہا۔ "او حبشی!" میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے گالیاں دیتے ہوئے کہا کہ اب مہینہ ختم ہونے والا ہے اگر چار دن کے اندر اندر تو نے میرا سارا قرضہ ادا نہیں کیا تو تجھے غلام بنا لوں گا اور تو اسی طرح بکریاں چراتا پھرے گا جیسا کہ پہلے چرایا کرتا تھا۔ مجھے بحیثیت انسان صدمہ تو بہت ہوا۔ مگر عشاء کی نماز کے بعد میں نے حضرت علیہ السلام کی خدمت اقدس میں یہ سارا واقعہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ آپؐ کے پاس اسوقت ادا کرنے کے لئے یہ قرض ہے اور نہ ہی میرے پاس۔ وہ شخص مجھے ضرور ذلیل کرے گا اس لئے اجازت عطا فرمائیے کہ جب تک قرض ادا کرنے کے لئے کوئی انتظام نہیں ہوتا اتنے دنوں کے لئے میں کہیں روپوش ہو جاؤں، جب کہیں سے آپ علیہ السلام کے پاس یہ قرض ادا کرنے کے لئے کچھ آجائے گا تو میں بھی حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔ یہ کہہ کر میں گھر چلا آیا۔ تلوار اور ڈھال اٹھائی اور جوتا پہنا۔ بس یہی میرا کل سامان تھا۔ میں شدت سے صبح ہونے کے انتظار میں تھا۔ صبح بھی اب ہونے والی تھی کہ ایک صاحبؓ دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور کہا کہ آپ رضؓ کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلا رہے ہیں، جلدی چلو۔ میں فوراً حاضر خدمت ہوا تو دیکھا کہ چار اونٹنیاں جن پر سامان بھی لدا ہوا تھا بیٹھی ہوئی ہیں — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بلالؓ! بہت خوشی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ قرض اتارنے کا انتظام فرما دیا ہے الحمد للہ علی ذالک یہ چاروں اونٹنیاں مع اسباب تیرے حوالے ہیں" میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور خوشی خوشی سب سے پہلے اسکا قرض ادا کیا۔ جب واپس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھے میرا انتظار فرما رہے تھے۔ میں نے واپس آکر عرض کیا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا بہت بہت شکر ہے جس نے سارے قرضہ سے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سبکدوش کر دیا ہے۔ آپ علیہ السلام نے دریافت فرمایا کہ آیا سامان میں سے کچھ باقی بھی ہے۔ عرض کیا جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو بھی ضرورت مندوں میں تقسیم ہی کر دو تاکہ مجھے راحت ہو جائے۔ فرمایا کہ بلالؓ میں اس وقت تک گھر نہیں جاؤں گا جب تک کہ یہ سارا سامان تقسیم نہ ہو جائے۔ سارا دن گذر گیا۔ عشاء کی نماز کے وقت آپؐ نے پھر دریافت فرمایا کہ سامان تقسیم ہو گیا ہے؟ عرض کیا اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! کچھ بچ گیا ہے تو آپ علیہ السلام نے وہ رات مسجد میں قیام فرمایا۔ پھر دوسرے دن عشا کی نماز کے بعد دریافت فرمایا بلال رضؓ اب وہ سامان تقسیم ہو چکا ہے؟ میں نے عرض کیا الحمد للہ وہ سب کا سب تقسیم ہو گیا ہے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرمایا حمد و ثنا فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت فکر تھی کہ خدانخواستہ اگر یہ مال بچ گیا اور موت آگئی تو! پھر گھر والوں میں تشریف لے گئے اللّٰھم ارزقنی اتباعہ۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دُنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند مبارک کو خالی دیکھنا بہت ہی مشکل ہو گیا اس لئے آپؓ نے ارادہ کر لیا کہ اب زندگی کے بقیہ ایام جہاد میں گذاروں گا۔ اس لئے آپؓ جہادوں میں شرکت کی غرض سے مدینہ منورہ سے الوداع ہو کر تشریف لے گئے۔ ایک عرصہ تک مدینہ منورہ واپس نہیں ہوئے تو اسی دوران آپؓ نے خواب میں دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں" بلال رضؓ یہ کیا ظلم ہے آپؓ ہمارے پاس کیوں نہیں آتے؟ تو آنکھ کھلتے ہی فوراً اسی وقت مدینہ منورہ کا سفر شروع کیا اور بہت ہی صبح صبح مدینہ منورہ پہنچا۔ حضرات حسنین

مگر حسنینؓ نے اذان کی فرمائش کی۔ ان لاڈلوں کی فرمائش کے تحت اذان کہنا شروع کی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک کی اذان کی آواز مدینہ منورہ کی گلی کوچوں میں پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا۔ عورتوں اور بچوں تک نے دوڑتے ہوئے گھروں سے باہر نکل کر اذان سنی۔ آپؓ فراق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے خود بھی بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے۔ پھر چند روز آپؓ کا قیام مدینہ منورہ میں رہا، اس کے بعد واپس ہو گئے اور ۲۰ھ میں دمشق میں آپؓ کا انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
ان مصائب کی وجہ سے جو صحابہ کرامؓ نے دین اسلام کو پھیلانے میں برداشت کی ہیں ان کے مرتبہ اور علو شان کو بڑھانے کے لئے ضروری تھا۔ پھر صحبت کا اثر بھی تھا اس لئے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"لاتسبوا اصحابی فلو ان
احدکم انفق مثل جبل
احد ذھبا ما بلغ احدھم
ولا نصیفہ۔
(بخاری شریف)

"میرے صحابہؓ کو گالیاں نہ دو اور نہ ہی انہیں برا کہو۔ وہ ہر طرح سے تم سے افضل ہیں۔ تم میں سے اگر کوئی جبل احد جتنا سونا خرچ کرے تو بھی میرے صحابہؓ کے ایک سیر یا آدھ سیر جو کے خرچ کرنے کے درجے میں نہیں پہنچ سکتا۔"

فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

- جسے سلامتی کی ضرورت ہو اسے خاموشی اختیار کرنی چاہیئے۔

بقیہ: اسلامی نظام حکومت

بارے میں کسی رائے کو صرف اسوقت عرف وعادت کا درجہ حاصل ہوتا ہے جب ملت مسلمہ کی اکثریت اسکو احسن گردانتی ہو۔ پھر ارباب اقتدار کے چناؤ کے لئے کسی اقلیتی رائے کو کیونکر صائب قرار دیا جا سکتا ہے۔ لہذا جو لوگ اکثریت عوام کو چھوڑ کر محض تعلیم یافتہ افراد کو ووٹ کا حق دینا چاہتے ہیں انہوں نے دین کی منشا کو سمجھا ہی نہیں۔ پیغمبر علیہ السلام نے جب خود صاحب وحی ہونے کے باوجود غیر منصوص احکام میں اپنی رائے کو امت کے مشورہ اور سبیل المومنین سے ہم آہنگ رکھا تو پھر کسی بھی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ سبیل المومنین کے برعکس صرف محدود افراد کی رائے کا تابع بنانے کی وکالت کرے۔

بعض لوگ موجودہ جمہوری طرز حکومت کے ووٹنگ سسٹم کے بارے میں یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں عالم، جاہل، زاہد، عاصی، متقی، فاسق کی رائے ہم پلہ قرار پاتی ہے، حالانکہ اسلام نے تقوی کو تمام تر فضیلتوں اور تکریمات کا معیار قرار دیا ہے جبکہ مغربی طرز جمہوریت میں نمائندوں کی اہلیتوں کے سلسلے میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ نہ ہی کوئی اس بات کا لحاظ رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں اصل صورتحال یہ ہے کہ اولاً تقوی کی پرکھ اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اس لئے اللہ تعالی نے فرمایا:
"اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ صاحب تکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو"

ثانیاً اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تقوی کی جانچ پڑتال انسان بھی کر سکتے ہیں تو پھر مسئلہ یہ پیدا ہوگا کہ ہر شخص کا معیار تقوی اپنا اپنا ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے کسی ایک مکتب فکر کے نزدیک کوئی شخص بہت متقی ہو جبکہ وہی شخص دوسرے مکتب فکر کے نزدیک سب سے زیادہ برا، قابل نفرت بلکہ گردن زدنی ہو بعینہ علمیت کی بھی یہی حالت ہوگی یعنی علم کی جانچ کے لئے کسی کا کوئی معیار ہوگا اور کسی کا کچھ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جس کو زیادہ لوگ اچھا سمجھیں وہی اچھا ہوگا[1] اور جس کو زیادہ لوگ عالم قرار دیں وہی عالم قرار پائے گا۔ یہی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت ہوتی ہے[2] ظاہر ہے ایسی صورت میں مسلمانوں کی اکثریتی رائے عوام الناس کی رائے ہی ہو سکتی ہے۔ خواص کی رائے نہیں ہو سکتی ورنہ پھر اس کی وضاحت ہو جاتی جیسا کہ قرآن مجید میں کئی مقام پر آیا ہے کہ:

"تم میں سے پیشتر جو بھی نبی آیا وہ مرد ہی تھا، اگر تم نہیں جانتے تو اس بات کی تصدیق اہل الذکر سے کر لو[3]"

ایسے معاملات میں اہل الذکر کی طرف رجوع کرنے کا اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ یہ علمی باتیں ہیں ان کے بارے میں اہل علم و ذکر ہی بتلا سکتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

(بقیہ حاشیہ) استعمال الناس حجۃ یجب العمل (ایضاً) دفعہ ۳۷) یہاں پر یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ عرف اور عادت کی اہمیت کے پیش نظر علمائے کرام نے اس پر کافی بحثیں کی ہیں اور ابن عابدین کی مشہور حنفی فقیہ نشر العرف کے عنوان سے ایک رسالہ بھی تصنیف کیا۔

[1] متذکرہ بالا حدیث کی رو سے مارآہ المسلمون حسنا فھو حسن

[2] ملاحظہ ہو حدیث حوالہ بالا نمبر (مارآہ المسلمون حسنا فھو حسن)

[3] وما ارسلنا قبلک الا رجالا نوحی الیھم فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ (سورۃ انبیاء آیت ۷)

مشاہیرِ ہند اور کالا پانی

قطع اعضاء کی سزائیں منسوخ:

۱۸۷۶ء میں لارڈ کارنوالس گورنر جنرل کے عہد میں ناک، کان، ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹنے کی سزائیں بند ہوئیں۔ نذروں اور رشوتوں کو ممنوع قرار دیا گیا۔ عدالتوں کی اصلاح ہوئی۔ دیوانی اور فوجداری کے محکمے علیحدہ علیحدہ ہوئے۔ نائب ناظم سے فوجداری اختیارات چھین لئے۔ مسلمانوں کے مقدمات میں شریعت کی پابندی ڈھیلی پڑ گئی۔ اس طرح شاستر کے پورے صوبوں پر عمل نہ کیا جاتا تھا۔ لارڈ کارنوالس نے ایک مجموعہ قوانین بھی مرتب کیا تھا جو کارنوالس کوڈ کے نام سے مشہور ہے۔

پنڈاروں کا خاتمہ:

پنڈارے لوگ جو کسی خاص ذات کے آدمی نہ تھے اور جو پہلے شیواجی کی فوج میں بھرتی ہوئے تھے، لوٹ مار سے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ ان میں کچھ پٹھان بھی تھے مگر رفتہ رفتہ سب قوموں کے بدمعاش ان سے آملے۔ انگریزوں کی خاموشی کی وجہ سے ان کا زور بڑھتا چلا گیا۔ وہ بڑا سنگدل اور ظالم گروہ تھا۔ وہ کبھی ایک جگہ قیام نہیں کرتے تھے۔ جس کسی صوبے میں جاتے وہاں قتل و غارتگری کرتے اور لوٹ مار مچاتے۔ ان کے دو دو، تین تین ہزار کے گروہ تھے جو چالیس چالیس، پچاس پچاس میل کا دھاوا مارتے تھے۔ ان کے لوٹنے اور ظلم کرنے کے یہ طریقے تھے کہ گرم راکھ کا تھیلا گردن سے لٹکا دیا کرتے تھے اور زور سے سانس لینے پر مجبور کرتے تھے۔ پھیپھڑوں پر اس کا اثر برا ہوتا تھا اور تھوڑی دیر میں آدمی مر جاتا تھا۔ مالکم لکھتا ہے کہ

"پنڈاروں کی مستورات ان کے ساتھ رہتی تھیں اور اپنے گھر والوں کے ظلم و ستم کو دیکھ کر وہ بھی بہت سنگدل ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ سانڈنیوں پر سوار ہو کر گھومتی تھیں اور دیہاتی لوگ ان کے مردوں سے زیادہ ان سے خائف ہوتے تھے۔

ہیسٹنگز کے زمانہ ۱۸۱۳ء تا ۱۸۲۳ء میں ان کے تین سردار تھے امیر خان، واصل محمد اور چیتو۔ یہ لوگ سندھیا کی فوجوں سے مل کر لوٹ مار کیا کرتے تھے اور دیہاتوں کو تباہ کرتے پھرتے تھے۔ ۱۶-۱۸۱۵ء میں انہوں نے نظام الملک کے ملک میں لوٹ مار کی اور شمالی اضلاع کو برباد کر دیا۔ لارڈ نڈکور نے ایک فوج تیار کی اور پنڈاروں کو محصور کر لیا جن میں سے بہت سوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ ۱۸۱۸ء تک پنڈارے ختم ہو گئے تھے۔ امیر خان نے ماتحتی قبول کی، واصل محمد نے خودکشی کی۔ چیتو کو چیتے نے کھا لیا اور سردار امیر خان کے عہدِ معاونت نے ریاست ٹونک دلوائی۔

رسمِ ستی کی ممانعت:

لارڈ بنٹنگ نے ۱۸۲۹ء میں ایک قانون پاس کیا جس سے رسم ستی ممنوع قرار دی گئی اور یہ اعلان کر دیا کہ جو ستی ہونے میں اعانت کرے گا اس کو قتل کی سزا دی جائے گی۔ ستی کا رواج ہندوستان میں عہدِ قدیم سے جاری تھا۔ ۱۸۲۹ء میں صرف بنگال میں سات سو عورتیں ستی ہوئی تھیں۔

جلاوطنی:

۱۷۸۴ء میں حکومت برطانیہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ذمہ داری خود لے لی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی قیدی کے لئے جلاوطنی کا قانون اسی طریقہ سے نافذ ہوا جس طرح انگلینڈ کے جلاوطنوں کے لئے، جو پہلی بستی تجویز کی گئی وہ بنکولین جنوب مغربی سماٹرا میں تھی۔ ۱۷۸۷ء میں ہندوستانی قیدیوں کا پہلا جتھا وہاں بھیجا گیا۔ وہاں قیدیوں کو عام طور پر سڑکیں بنانے اور جنگل صاف کرانے کے کام میں لگایا جاتا تھا اور کئی قیدی وہاں کے سرمایہ دار لوگوں کے جن کے پاس باغات ہوتے 'کرایہ' پر دے دیے جاتے تھے۔ وہاں قیدی اپنی شادی کر لیتے تھے۔ چنانچہ بہت سے قیدی وہاں سے بوجہ مجبوری نہیں آسکتے تھے۔ چنانچہ سر اسٹامفورڈ رلیفس گورنر ۱۸۱۸ء میں لکھتا ہے،

جلاوطنوں کو واپس جانے کی خواہش نہیں رہتی وہ وہاں کافی تعلقات پیدا کر لیتے ہیں اور کئی باتیں ان کی کشش کے لئے وہاں ہوتی ہیں۔ اس لئے

وہاں سے واپس آنا وہ ایک سخت سزا تصور کرتے ہیں"۔

اس تحریر میں اگرچہ مغالطہ سے کام لیا گیا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کو جو کنوارپن میں وہاں کوفت ہوتی ہے وہ شادی کے بعد چلی جاتی ہے۔ وہ اپنے وطن میں آنا خوش قسمتی سمجھتے ہیں، بدقسمتی نہیں ــــ ۱۸۲۳ء میں ہندوستانی جلاوطنوں کے لئے ڈچ بستی مقرر کی گئی اور انکو پینانگ میں رکھا جانے لگا۔ ۱۸۲۵ء میں سنگاپور اور ملاکا میں جلاوطن بھیجے جانے لگے اور پینانگ میں بھیجنے کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ وہاں ایک بڑا کامیاب تجربہ ہوا جس کا اثر ہندوستان کی جیلوں کے نظام پر اچھا پڑا، جو یہ تھا کہ قیدیوں کو وارڈ مقرر کیا جانے لگا۔ یہ تجربہ مسٹر بون ہم ریذیڈنٹ سنگاپور کو اسوقت ہوا جبکہ انہوں نے محسوس کیا کہ قیدی سبق آموز کام کریں تو ان سے یہ کام کیوں نہ لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا چپراسی علیحدہ کر دیا اور اس کی جگہ بنگالی اور مدراسی قیدی لگائے اور ان قیدیوں پر وارڈ مقرر کر دیا۔ اس تجربہ کی وجہ سے تمام ہندوستان کی جیلوں میں اس طریقہ کو رائج کیا گیا۔

مسٹر بارکراز امپریز نٹنٹ

مسٹر بلٹبس کی بستیاں جہاں جلاوطن قیدی رکھے جاتے تھے، وہ ۱۸۲۵ء سے ۱۸۷۳ء تک ۴۸ سال رہیں اور بعد میں بند کر دی گئیں، لیکن ۱۸۶۷ء میں مسٹر مان عمر بھر کے قیدیوں کے ساتھ پینانگ سے انڈمان گئے اور وہاں جلاوطنوں کے لئے نئی بستیاں تیار کرانی شروع کیں۔ اس مقام پر ۱۸۷۳ء میں ان جلاوطنوں کو رکھا گیا جن کی سزا کی معیاد ختم نہیں ہوئی تھی، لیکن جو تعطیل پر گئے تھے، ان کو آبادی میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی، لیکن ۱۸۷۳ء کے بعد تمام جلاوطنوں کو جو کہ جسمانی طور پر تندرست تھے، انکو انڈمان بھیجا جاتا تھا اور خاص طور پر مارچ ۱۸۵۸ء سے بغاوتِ ہند کے قیدی یہاں لا کر رکھے جانے لگے، چنانچہ مولانا جعفر تھانیسری اپنی تصنیف کالا پانی میں تحریر فرماتے ہیں۔

مشاہیر ہند کالے پانی کے قیدی:

غدر ۱۸۵۷ء کے بدولت بیسیوں راجے نواب، زمیندار، مولوی، مفتی، قاضی، ڈپٹی کلکٹر، منصف، صدر، امین، صدر الصدور، رسالدار، صوبہ دار، جمعدار وغیرہ وہاں قید تھے۔ وہ معزز ہندوستانی جن کے آگے سینکڑوں ہزاروں نوکر رہتے تھے، سیاہ پوست اور ہندی ہونے کی وجہ سے دوسرے چوہڑے چماروں کی طرح موٹا جھوٹا کھانا پاتے اور عام لوگوں کے ساتھ سخت مشقت کرتے تھے، مگر حضرات یورپین گورے بلکہ اکثر دوغلے کالے کلوٹے بھی فقط بوجہ شرف کوٹ پتلون یا کلمہ عیسائی کے پلٹن کے گوروں کے برابر کھانا کپڑا پاتے تھے۔ ایک علیحدہ بنگلہ ان کے رہنے کو، ایک نوکر بلا تنخواہ خدمت کے لئے اور جس گورے یا دوغلہ کو لائسنس مل گیا تو ان کو پچاس روپے ماہوار تک نقد تنخواہ ملتی تھی۔

کالے چمڑے کی بے عزتی:

یہ تو سب کچھ تھا مگر ۱۸۷۹ء کا ایک نیا واقعہ حیرت انگیز دیکھ کر لوگوں کو رونا آتا تھا اور وہ یہ ہے کہ ۱۸۷۹ء میں ایک بدبخت راجہ جگن ناتھ پوری جس کے واسطے مدت تک اخباروں نے بھی سر پھوڑا تھا، قید ہو کر کالے پانی پہنچا۔ مگر بوجہ کالا چہرہ ہونے کے بیچارہ عام چوہڑے اور چماروں کے ساتھ کھانا پاتا اور مشقت کرتا تھا، اور جب نازک مزاجی سے وہ مشقت نہ کر سکتا تو بید اور جیل اور چکی پیسنے کی سزا پاتا رہا۔ آخر انہیں صدموں سے تھوڑے روز بعد وہ راجہ وہ پیر جیل میں مر گیا اور انہیں ایام میں مسٹر ٹیمیر نامی ایک کرانی بھی گوبدن سے کالا مگر یورپین نام اور کوٹ پتلون سے مشرف ملک اودھ سے قید ہو کر وہاں پہنچا تھا۔ وہاں اس کو گوروں کے ساتھ عمدہ کھانا ملنے لگا۔ ایک علیحدہ مکان پلنگ وغیرہ کا سامانِ عیش و آرام بھی اس کو دیا گیا اور بجائے مشقت کے کچہری ڈپٹی کمشنر میں کلرک ہو گیا۔ چونکہ یہ کمبخت راجہ اور خوش نصیب کرانی دونوں ایک ہی وقت وہاں پہنچے تھے، یہ اختلاف سلوک وطرفداری اور ناقدری شرفاء امراء ہند دیکھ کر ہر ایک کو رونا آتا تھا۔

دَاغ دَائم الحبس:

۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۵ء تک یہ قاعدہ رہا کہ جو قیدی کالے پانی میں جاتا اس کا ماتھا کھود کر پیشانی پر ان کا نام اور جرم اور لفظ دائم الحبس لکھا جاتا تھا۔ وہ نوشت مثل نوشتۂ تقدیر تمام عمر نہیں مٹتا تھا۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں کہ:

"یہ قاعدہ ہمارے پہنچنے سے
کچھ پہلے تمام عملداری میں
موقوف ہو گیا تھا اس سبب سے
داغ دائم الحبس سے ہم محفوظ
رہے"۔

سنہ سے ۱۸۶۵ء تک اس جزیرہ کی آب وہوا سم قاتل تھی، چنانچہ جس کو زخم ہو جاتا تھا وہ تین روز بعد سڑ جاتا اور چوتھے دن مر جاتا۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو انڈمان پہنچے جب وہاں کی آب وہوا اچھی ہو گئی تھی۔

قیدیوں کے ساتھ سلوک:

بیماری کی کثرت اور نئی آبادی کی وجہ

سے حکومت نے شروع میں قیدیوں کے واسطے قانون نہایت نرم رکھے اور قیدیوں سے بہتر سلوک کیا جاتا تھا، مگر جب وہاں کی آب و ہوا عمدہ ہو گئی تو ۱۸۷۶ء میں سخت قانون نافذ کر دیے جو ہندوستانی جیلوں میں بھی روا نہیں رکھے گئے تھے۔ چنانچہ قانون انڈمان مصدرہ ۱۸۷۶ء کی غایت یہ تھی کہ سزائے حبس بعبور دریائے شور سے سخت مشقت لینا اور فقط اسقدر کھانا پینا دینا جس سے آدمی زندہ رہ سکے اور مرنے نہیں۔ اس جزیرے میں قیدیوں کے رہنے کا عام قاعدہ یہ تھا کہ جہاز سے اترتے ہی ایک مہینہ بعد ان کی بیڑی کٹ جاتی تھی۔ یہاں کوئی جیل نہیں ہے۔ بارکوں میں یہ قیدی ماتحت قیدی افسروں کے رہتے ہیں۔ ان میں ہندوستانی قیدیوں کی طرح مشقت کرتے ہیں۔ دو وقت ان کو پکا ہوا کھانا ملتا ہے۔ رات کو انہیں بارکوں میں سو رہتے ہیں۔ ان بارکوں کے محافظ سوائے قیدی افسروں کے اور کوئی پولیس یا جنگی پلٹن نہیں ہوتی تھی۔ غرض قیدیوں کی حفاظت اور نگرانی اور ان کا کام تقسیم کرنا اور ان سے کام کروانا یہ سب پرانے قیدی افسروں کے سپرد ہے جو سر پر لال پگڑی اور گلے میں چپراس ڈالے رہتے اور حسب مدارج اپنے عہدوں کے سوا خوراک کی نقد تنخواہ بھی سرکار سے پاتے ہیں۔ ان نئے قیدیوں کو بھی بشرط نیک چلنی تین چار برس کے بعد کسی قدر تنخواہ ملنے لگ جاتی ہیں اور تنخواہ پانے کے بعد نئے قیدی بھی پہلے والے افسر مقرر ہو جاتے ہیں۔ دس برس نیک چلن رہنے کے بعد ہر ایک مرد قیدی ٹکٹ پانے کا مستحق ہو جاتا ہے اور ٹکٹ یہ ہے کہ ہر قیدی آزاد ہو کر بارک سے نکل جاتا ہے۔ وہ شہر اور بستیوں میں رہ کر جو چاہے پیشہ کرے اور کھانے کھائے۔ قریب پچاس ساٹھ قیدیوں کی بستیاں آباد ہیں، جن میں قیدی ہی نمبردار اور چوکیدار اور پٹواری ہیں۔ جو لوگ کھیتی کرنے کا ٹکٹ لیتے ہیں ان کو گاؤں میں تو تو ڑ زمین بقدر پانچ ایکڑ کے مفت سرکار سے مل جاتی ہے اور تین برس تک محصول معاف رہتا ہے، اور کبھی کبھی تقاوی، بیل اور خوراک سے بھی سرکار مدد دیتی ہے۔ یہ ٹکٹ پانے کے بعد قیدی آزاد ہو جاتا ہے جو چاہے کرے۔

قیدی عورتیں:۔

جو عورتیں قید ہو کر آتی ہیں وہ ایک علیحدہ جزیرے میں ماتحت قیدی عورتوں اور افسروں کے بارک میں رہتی ہیں۔ عورتوں کو بھی اپنی باری کے اندر پسائی سلائی وغیرہ کی مشقت کرنی پڑتی ہے۔ عورتوں کو پانچ برس کے بعد آزادی کا ٹکٹ مل جاتا ہے، لیکن جوان عورتیں جب تک شادی نہ کر لیں ٹکٹ پا کر اپنی بارک سے باہر نہیں جا سکتیں۔ پانچ برس میں سوائے ٹکٹ والوں کے مستثنیٰ بارک باشی قیدی شادی نہیں کر سکتے۔

شادی کا طریقہ:

جو مرد شادی کرنا چاہتا ہے وہ عورتوں کے ٹاپو میں جا کر کسی عورت کو پسند کر کے کچھ ان کو دے دلا کر راضی کر لیتا ہے۔ منظور ہوتا ہے تو ان کو ایک اقرارنامہ اپنی رضامندی اور محبت و موافقت سے مل کر رہنے کا چیف کمشنر کے روبرو لکھ دینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد بیوی میاں کے گھر میں چلی آتی ہے۔ ٹکٹ والے قیدی ملک سے اپنے بال بچوں کو بھی بلا سکتے ہیں۔ جب کوئی قیدی بیس برس تک نیک چلن رہتا تو اپنے وطن آ سکتا ہے اور ٹکٹ پانے کے بعد قیدی کو اختیار ہے کہ جائز کمائی سے چاہے لاکھوں روپے جمع کر لیں مگر ٹکٹ سے پہلے بلا اطلاع و اجازت حکام وہ کچھ اپنے پاس نہیں رکھ سکتے اور نہ کسی دوسرے کے پاس جمع کرا سکتے ہیں۔ قیدی جب تک بارک میں رہ کر مشقت کرتے ہیں ایک برس یا تین مہینے میں ایک خط اپنے گھر روانہ کر سکتے ہیں۔

بقیہ: شیخ الاسلام اور تحریک پاکستان

مہر منیر طلوع ہوگا اس صبح امید کی نمود تک ہم نومیدیوں کی شب تار کو اپنی قربانیوں کے نور سے روشن رکھیں گے اور اسلام کے سچے فرزندوں کی طرح ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے۔"

ایک مسلمان، ایک عالم دین، ایک معلم ایک سماجی خدمت گذار اور ایک درد مند شہری کے لئے انکی زندگی میں ایک مثال موجود ہے۔ یہ ایسی زندگی ہے جو ایک محدود دائرہ سے نکل کر آفاقی ہو جایا کرتی ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جو ایک فرد کے جسم و جان میں دم لیتے ہوئے پوری ملت اور قوم میں دوڑ جاتی ہے۔ مبارک ہیں وہ ہستیاں جو ایک لگن اور آرزو میں سلگتی رہتی ہیں اور مرتے مرتے وہ شعلہ پرسوز بن جاتی ہیں، جن سے عالم روشنی لیتا ہے۔ ان لوگوں کی قبریں زندہ ہیں کہ ان کا [illegible] حیات بھی منور اور رہنما ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے حضرت شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے رفقائے کار کی یاد میں شرکت کے لئے نوازا گیا۔

جس شخص نے زندگی بھر صدق کی شہادت دی اور جس نے صدق کی راہ پر جان دی، سلام اس دن پر جب وہ پیدا ہوئے۔ اس دن پر جب انہوں نے دنیا سے پردہ کیا اور اس دن پر جب وہ پھر زندہ ہو کر ارواح عالم کے ساتھ ہوں گے۔ آخر میں علامہ اقبال کے اس شعر کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں ؎

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

والسلام

ترجمان اسلام میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیں۔

تحریر: ابوعمار زاہد الراشدی

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

تحریکِ پاکستان کے لئے اُن کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے وہ مایۂ ناز سپوت ہیں جنہوں نے علمی، دینی و سیاسی محاذ پر ملتِ اسلامیہ کی بھرپور راہ نمائی کی اور اپنی خداداد علمی و فکری صلاحیتوں سے ملتِ اسلامیہ کو فیض یاب کیا۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ممتاز ماہرِ تعلیم مولانا فضل الرحمٰن کے فرزند تھے۔ آپ نے اپنی تعلیم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ جیسے عالمِ دین کے زیرِ سایہ مکمل کی۔ انہوں نے دیوبند میں ہی تدریس و تعلیم کا آغاز کیا حتیٰ کہ ایک وقت میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم کی حیثیت سے بھی فرائض سرانجام دیے۔

آپ اپنے وقت کے بہت بڑے عالمِ دین، محدث، فقیہہ، متکلم اور خطیب تھے۔ خطابت کے محاذ پر آپ کو مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے ساتھ وقت کے چار بڑے خطیبوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ علمی دنیا میں ہزاروں شاگردوں کے علاوہ قرآن کریم کی تفسیر اور صحیح مسلم پر فتح الملہم کے نام سے عظیم المرتبت شرح کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ درجن سے زائد علمی تصانیف آپ کی یادگار ہیں جن پر آپ کے معاصرین نے آپ کو بجا طور پر متکلمِ اسلام اور مفسرِ اعظم کے القاب سے یاد کیا۔

مولانا عثمانیؒ کی علمی عظمت کا اندازہ ان کے سب سے اہم معاصر اور سیاسی طور پر حریف مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے ان الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے مولانا عثمانیؒ کی وفات پر دارالعلوم دیوبند کے تعزیتی جلسہ میں کہے:

"مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی شخصیت بے مثال تھی۔ علم و فضل میں آپ کا پایہ بلند تھا۔ ہندوستان کے چیدہ علماء میں سے تھے اور علمی طور پر ان کی شخصیت "مسلمۂ کل" تھی۔"

اسی طرح مفتی اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہؒ دہلویؒ نے اپنے بیان میں کہا:

"مولانا شبیر احمد عثمانیؒ دیوبندی کی وفات حسرت آیات ایک سانحۂ عظمیٰ اور داہیۂ کبریٰ ہے۔ مولانا مرحوم وقت کے بڑے عالم، پاکباز، محدث، مفسر اور خوش بیان مقرر تھے۔"

متذکرہ آراء سے جہاں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی علمی عظمت ثابت ہوتی ہے وہاں یہ احساس بھی اجاگر ہوتا ہے کہ سیاست میں ایک دوسرے سے شدید اختلاف رکھنے کے باوجود ان حضرات کو ایک دوسرے کی عظمت کے اعتراف میں کوئی تامل نہ تھا۔ سیاست میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ابتداء میں تحریکِ خلافت اور جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم پر تحریکِ آزادی کے لئے سرگرمی کے ساتھ کردار ادا کیا لیکن قیامِ پاکستان کے مطالبہ کے بعد جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے ہندوستان کو تقسیم کرنے کی مخالفت کی وجہ سے مولانا عثمانیؒ جمعیۃ علماء ہند سے علیحدہ ہو گئے اور جب تحریکِ پاکستان کے حامی علماء نے ١٩٤٥ء کے ہنگامہ خیز سال میں چار روزہ کلکتہ کے کل ہند اجتماع میں "جمعیۃ علماء اسلام" کے نام سے جماعت تشکیل دی تو اس کا صدر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو چن لیا گیا۔ علامہ عثمانی نے جمعیۃ علماء اسلام کے صدر کی حیثیت سے تحریکِ پاکستان میں سرگرم کردار ادا کیا، اور ملتِ اسلامیہ کو پاکستان کے حق میں ہموار کرنے کے لئے شبانہ روز انتھک محنت کی۔ ان کے اس کردار پر روزنامہ "احسان" نے یہ تبصرہ کیا تھا:

"جب کانگریس کے نام پر ہندو امپریلزم کے پھیلتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے علامہ عثمانیؒ مسلم لیگ کے ہمنوا بنے تو عوامی اعتماد اور ہر دلعزیزی کی جس راہ کو طے کرنے میں دوسرے لیڈروں کو سالہا سال صحرا نوردی کرنی پڑی اسے آپ نے چند ہفتوں میں طے فرما لیا۔"

ایک دوسرے اخبار نے اس طرح اپنی رائے ظاہر کی:

"اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ قائد اعظم کی سیاسی بصیرت اور قانونی مہارت کے ساتھ ساتھ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے تبحرِ علمی اور فیضِ روحانی نے مسلمانوں کو وہ قوتِ عمل بخشی کہ انہوں نے صدیوں کا راستہ چند برس میں طے کر لیا۔"

تحریکِ پاکستان میں حکیم الامت مولانا

اشرف علی تھانوی رح کی حمایت اور علامہ شبیر احمد عثمانی رح ان کے رفقاء مولانا ظفر احمد عثمانی رح، مولانا اطہر علی اور مولانا مفتی محمد شفیع رح کی سرگرم جدوجہد تحریک پاکستان کا ایسا روشن باب ہے جس سے کوئی مورخ صرف نظر نہیں کر سکتا اور ان حضرات کی خدمات کا سب سے بڑا عملی اعتراف یہ ہے کہ قیام پاکستان کے موقع پر پاکستان کا پرچم لہرانے کا شرف کراچی میں علامہ شبیر احمد عثمانی رح اور ڈھاکہ میں ظفر احمد عثمانی رح کو حاصل ہوا۔

قیام پاکستان کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانی رح نے ملک میں اسلامی نظام کے اس وعدہ کی تکمیل پر توجہ مبذول کر دی جس کی بنیاد پر انہوں نے تحریک پاکستان کی حمایت کو اپنا مشن بنا لیا تھا۔ چنانچہ "قرارداد مقاصد" کی وہ تاریخی دستاویز آپ ہی کی مساعی سے دستور ساز اسمبلی نے منظور کی جو رہتی دنیا تک پاکستان کی نظریاتی اساس کی حفاظت کرتی رہے گی۔ انہوں نے ان لوگوں کے عزائم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جو چاہتے تھے کہ پاکستان کو ایک لادینی ریاست بنا دیا جائے۔ چنانچہ علامہ عثمانی رح نے اپنے عزم کا اظہار یوں کیا:

"خواہ ارباب اقتدار ہمارے ساتھ کچھ بھی برتاؤ کریں ہم اس کوشش سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتے کہ مملکت پاکستان میں اسلام کا وہ دستور و آئین اور وہ نظام حکومت تشکیل پذیر ہو جس کی رو سے اس بات کا مؤثر انتظام کیا جائے کہ مسلم قوم اپنی زندگی اسلام کے انفرادی و [illegible] تعلیمات کے مطابق جو قرآن و سنت سے ثابت ہوں مرتب اور منظم کر سکیں۔"

(بحوالہ تجلیات عثمانی ص—)

بحضورِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

احمد ندیم قاسمی

یوں تو ہر دَور مہکتی ہوئی نیندیں لایا
تیرا پیغام مگر خواب نہ بننے پایا!
تُو جب آیا تو مٹی روح و بدن کی تفریق
تو نے انسان کے خیالوں میں لہو دوڑایا
جن کو دھندلا گئے صدیوں کی غریبی کے غبار
ان خد و خال کو سونے کی طرح چمکایا
سمٹ آیا ترے اک حرفِ صداقت میں وہ راز
فلسفوں نے جسے تا حدِّ گماں الجھایا
راحتِ جاں ترے خورشیدِ محبت کا طلوع
دھوپ کے روپ میں ہے ابرِ کرم کا سایا
قصرِ مرمر سے شہنشاہ نے از راہِ غرور
تیری کُٹیا کو جو دیکھا تو بہت شرمایا
کتنا احسان ہے انسان پہ تیرا کہ اسے
اپنی گفتار کو کردار بنانا آیا

○

شادی بیاہ و دیگر تقریبات پر
لذیذ و خوش ذائقہ مٹھائیوں کے لئے
آصف موتی چور
فون ۹۹۲
"عمدہ چائے"
ٹھنڈے مشروبات اور آئس کریم
پروپرائٹر:- امانت علی اینڈ برادرز، میاں چنوں، ضلع ملتان

ملکی سالمیت کے پیش نظر نوجوانوں کیلئے فوجی تربیت لازمی قرار دی جائے

★ ندیم اقبال اعوان

جمعیۃ طلبہ اسلام پاکستان کے مرکزی ناظم عمومی جناب ندیم اقبال اعوان نے کہا کہ ملکی سالمیت کو درپیش خطرات کے پیش نظر نوجوانوں کے لئے فوجی تربیت لازمی قرار دی جائے۔ انہوں نے کہا کہ افغانستان میں روسی جارحیت اور بڑی طاقتوں کی ہوس ملک گیری کے خطرات سے نمٹنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے نوجوانوں کو فوجی تربیت دی جائے تاکہ وہ داخلی اور خارجی محاذ پر ملکی سالمیت کے لئے اہم کردار ادا کر سکیں۔

انہوں نے کہا کہ امریکہ جیسے ملک جنکا دفاع مضبوط ہے اور حریف قوت سے کوسوں میل دور ہے وہاں فوجی بھرتی جارہی ہے اور نوجوانوں کو منظم کیا جارہا ہے لیکن ہمارے سروں پر خطرات منڈلا رہے ہیں اور افسوس کہ ہم کوئی پروگرام ترتیب نہیں دے رہے۔ لہٰذا ان حالات میں ضروری ہے کہ ملکی سطح پر رضا کار بھرتی کئے جائیں جن کو آنے والے خطرات سے نمٹنے کے لئے خصوصی تربیت دی جائے۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر انعامی مقابلہ

جمعیۃ طلبہ اسلام کے زیر اہتمام سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر گورنمنٹ ہائی سکول جھاوریاں میں ایک انعامی مقابلہ ہوا جس کے مہمان خصوصی بلدیہ کے چیئرمین جناب قاضی محمود الحسن تھے۔ جبکہ صدارت جناب ہیڈ ماسٹر چوہدری محمد انور باجوہ نے کی۔

سٹیج سیکرٹری کے فرائض جمعیۃ طلبہ اسلام جھاوریاں کے نائب صدر راجہ محمد اعجاز نے انجام دیے جبکہ جج صاحبان میں ملک احمد خان، ملک احمد بخش، مولانا محمد اسمٰعیل شامل تھے۔ اول، دوم اور سوم آنے والے طلبہ کو انعامات دیے گئے۔ انعام حاصل کرنے والوں میں محمد شاکر، محمد فاروق، کفایت اللہ، انور علی ندیم، جاوید اقبال نصر اقبال اور محمد اقبال شامل ہیں۔

جمعیۃ طلبہ اسلام کے ساتھیوں:

۱۔ جناب غلام رسول مینگل، سابق ناظم عمومی جمعیۃ طلباء اسلام، بلوچستان،

۲۔ عبد القیوم طاہر ناظم عمومی، جمعیۃ طلبہ اسلام کراچی ڈویژن،

۳۔ مولانا محمد ابوبکر حمزہ جھنگ،

۴۔ جناب اقبال شیروانی جھنگ،

۵۔ محمد جاوید اختر، صدر، جمعیۃ طلبہ اسلام، جھنگ،

۶۔ محمد حفیظ خان، صدر، جمعیۃ طلباء اسلام، ضلع جھنگ

اور دیگر ساتھیوں نے قائد طلبہ جناب جاوید ابراہیم پراچہ کے والد گرامی کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے! اور دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

میرواہ گورچانی (سندھ)

جمعیۃ طلبہ اسلام صوبہ سندھ کے ناظم عمومی جناب محمد اسلام تمنا اپنے صوبائی دورہ کے درمیان میرواہ گورچانی بھی گئے جہاں انہوں نے مقامی شاخ کا ریکارڈ چیک کیا شاخ کے صدر حافظ احمد علی نے رپورٹ پیش کی۔ آخر میں انہوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہم صرف رضائے الٰہی کے حصول کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں

رستم (ضلع شکارپور)

گذشتہ دنوں جمعیۃ طلبہ اسلام رستم ضلع شکارپور کا ایک اجلاس جناب دین محمد قریشی کی صدارت میں ہوا۔ اجلاس میں جناب دین محمد قریشی جناب عبد الغنی اور جناب نور مصطفےٰ نے خطاب کیا۔ علاوہ ازیں اجلاس میں عبد الحمید در محمد۔ فیض محمد۔ محمد فاروق، سکندر علی عبد الشکور۔ عبد الرحیم۔ غلام ہادی اور دیگر طلبہ نے شرکت کی۔

نرخنامۂ اشتہارات

ہفت روزہ
ترجمان اسلام
چوک رنگ محل، لاہور - ۸

اکتوبر ۱۹۷۹ء سے نافذ

مکمل آخر سرورق کا صفحہ	۷۰۰ روپے	نصف	۳۵۰ روپے
" آخر سرورق سے پہلا صفحہ	۶۰۰ روپے	نصف	۳۰۰ روپے
" اندرون عام صفحہ	۵۰۰ روپے	نصف	۲۵۰ روپے

فی سینٹی میٹر سنگل کالم ۶ روپے یا ۱۵ روپے فی سنگل کالم انچ

زیر معاہدہ اشتہارات پر رعایت

سال میں کم از اشاعت ... ... ۳۷۵ سینٹی میٹر پر

رعایت
۲۰ فی صد

رابطہ کے لئے
شعبہ اشتہارات، ہفت روزہ ترجمان اسلام
چوک رنگ محل، لاہور - ۸ ٹیلی فون - ۶۷۷۱۵